www.urducouncil.nic.in

مارچ 2022 ، قیمت :- ₹10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تا کہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

بچوں کی دنیا

جلد: 10 شمارہ: 03 مارچ 2022

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: شاہنواز محمد خرم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ تعلیم۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10روپے، سالانہ/100روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی - 110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد - 500002

فون:040-24415194

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
کافی: ایک دلچسپ کھوج	سلمیٰ یوسف حسین	06
سورج بنام کورونا	سید شمیم احمد مدنی	08
آلودگی کے نقصانات	ناظمہ پروین	11
طلبا امتحان کس طرح دیں	حارث حمزہ لون	14
میرا بچپن		
ایسا تھا بچپن	حیدر بیابانی	16
نظمیں		
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں	نذیر بنارسی	21
بھاگو یار کورونا آیا	فریاد آزر	22
طوطا	ظہیر رانی بنوری	23
شاپنگ مال	ضیاء الرحمن جعفری	23
ماں	شبیر اصغر	24
واہ پکوڑی	فہیم احمد	24
میرا گاؤں	وزیر عالم	25
ٹکنالوجی دے گی زبان	حبیب سیفی	26
سڑکیں	جاوید رانا	27
ترجمہ		
آنکھیں بند کرو نانی	دِوِک رمیش/استوتی اگروال	28
کہانیاں		
مسٹر لائبریرین	رونق جمال	31
انار	اقبال برکی	33
اندھیرے گھر کا چراغ	سلیم خان	36
نا، بابا، نا	رحیم رضا	38
رواداری	متین الدین	40
ایک گلاس دودھ	ضیاء الحسن	43
اور کتابیں رو پڑیں	گلزار خالد اعظمی	45
کھیل/کھلاڑی		
منصور علی خاں پٹودی	سلام بن عثمان	48
بچوں کا کتب خانہ		
روشنی کا سفر	شاہد حبیب	51
سائنس نامہ		
لوئس پاسچر	عبدالمجید مکرو	53
صحت اطفال		
یادداشت بڑھانے کے 9 آسان طریقے	سالک دھامپوری	55
زبان شناسی		
لفظوں کا صحیح استعمال		57
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		59
ننھے فنکار		
تدبیر سے تقدیر بدلی	ہاجرہ	60
پینٹنگ		62

پیارے بچو!

ہر انسان کے اندر قدرت نے مختلف قسم کی بے شمار صلاحیتیں رکھی ہیں۔ ایسی اہم صلاحیتوں میں بولنے اور لکھنے پڑھنے کی صلاحیتیں بھی شامل ہیں۔ انسان ان اوصاف کی وجہ سے قدرت کی پیدا کردہ اَن گنت مخلوقات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ جب یہ عظیم صلاحیتیں انسان کو بخشی گئی ہیں تو انسان کو اپنی ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے اور بولنے، لکھنے اور پڑھنے میں کسی بھی طرح کمزور نہیں ہونا چاہیے مگر یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ یہ تمام صلاحیتیں بچپن میں ہی پروان چڑھتی ہیں۔ چند ماہ کا معصوم سا بچہ اپنے ماں باپ کی زبان سے نکلنے والے لفظوں کو سمجھنے لگتا ہے اور پھر جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، وہ ان الفاظ کو بولنے بھی لگتا ہے۔ گویا کہ اس کے بولنے میں والدین کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ والدین جس طرح کی زبان بولتے ہیں وہ بھی اسی طرح کی زبان بولتا ہے۔ وہ پوری طرح سے والدین کے لہجے اور تلفظ کی نقل کرتا ہے۔ اگر والدین اچھی زبان بولتے ہیں، تو بچہ بھی اچھی زبان بولنے لگتا ہے۔ اس لیے والدین کے اوپر اپنے بچے کو اچھی زبان سکھانے کی بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے سامنے اچھی زبان اور الفاظ استعمال کریں۔

والدین کے علاوہ بچہ اپنے دوسرے رشتے داروں، پڑوسیوں اور محلّہ داروں سے بھی زبان سیکھتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد جس طرح کی زبان سنتا ہے، سیکھ جاتا ہے اور اسی طرح بولنے بھی لگتا ہے۔ کئی مرتبہ گھر کے باہر بولے جانے والے الفاظ اس کے ذہن میں جگہ بنا لیتے ہیں اور وہ انھیں برجستہ استعمال کرنے لگتا ہے۔ اب اگر گھر سے باہر کا ماحول اچھا ہوتا ہے اور اچھی زبان بولی جاتی ہے تو یہ ماحول زبان سیکھنے کے تعلق سے بچے کے لیے سود مند ثابت ہوتا ہے۔ اگر باہر سطحی اور غیر معیاری زبان بولی جاتی ہے تو اس کا منفی اثر بچے کی زبان پر پڑ سکتا ہے، اس لیے والدین کو چاہیے کہ اپنے بچوں کو ایسا ماحول مہیا کرائیں جو بچوں کی زبان کو صاف، شستہ، شائستہ اور عمدہ بنانے میں معاون ثابت ہو۔ زبان سیکھتے اور بولتے وقت تلفظ پر خصوصی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ اسے ایک غیر ضروری چیز سمجھ کر نظر انداز نہ کریں کیونکہ درست تلفظ سے زبان میں مٹھاس اور کشش پیدا ہوتی ہے اور غلط تلفظ سے عمدہ الفاظ کا حسن بھی جاتا رہتا ہے۔

پیارے بچو! اگر آپ اچھی زبان بولنا اور لکھنا چاہتے ہیں تو آپ ایسے بچوں کی صحبت اختیار کریں، جو اچھی زبان بولتے ہیں، جو بچے سطحی زبان کا استعمال کرتے ہیں، ان سے آپ کو بچنا چاہیے۔ اس کے علاوہ آپ کو ایسی کتابیں بھی پڑھنی چاہئیں جو زبان سکھانے یا زبان کو بہتر بنانے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ بچو! زبان کے تعلق سے آپ کو بہت زیادہ سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے، کیونکہ بڑے ہوکر اچھی زبان آپ کو معاشرے میں ایک پہچان دلائے گی اور آپ کی شخصیت میں بھی چار چاند لگیں گے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

'بچوں کی دنیا' دسمبر 2021 کا شمارہ وصول ہوا۔ اس میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ کتابیں نہ صرف بچوں کی بہترین دوست ہوتی ہیں بلکہ یہ اُن کی زندگی بھی سنوارتی ہیں۔ کتابیں پڑھ کر ہی بچے بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔ کتابیں دکانوں، کتب خانوں اور اسکولوں میں بھی ملتی ہیں اور آج کل تو قومی اردو کونسل کی موبائل وین، موبائل ایپ اور ویب سائٹ پر بھی کتابیں محض ایک کلک پر حاصل ہوجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس شمارے کے 62 صفحات پر دو درجن سے زیادہ دلچسپ مضامین، نظمیں، کہانیاں وغیرہ موجود ہیں۔ گویا یہ علم و ادب کا ہنستا کھیلتا گہوارہ ہے جو آپ کا دل بہلائے اور زندگی سنوار دے۔ اس میں صفحہ 58 پر 'زبان شناسی' ضرور پڑھیں کیونکہ اس مضمون میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ حروف الفاظ اور املا میں تلفظ یعنی کسی حرف یا لفظ کی آواز کیسے نکالیں اور یہ بھی کہ الفاظ بنتے کیسے ہیں اور ساتھ میں ان کے معنی بھی بتائے گئے ہیں۔ ان باتوں سے لکھنے پڑھنے اور صحیح بات چیت کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ہیں نا یہ تمام دلچسپ باتیں اور کیا چاہیے؟

مصطفیٰ ندیم خان غوری، بی 11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

فروری 2022 کا ماہنامہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ بچوں کے کتب خانے کی شروعات بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے ملک بھر میں بچوں کے شائع ہونے والے رسالوں اور کتابوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ خود میں نے اس کالم میں پھول میگزین کا تعارف دیکھ کر اپنے لیے ایک شمارہ منگوایا تھا جو مرتضیٰ ساحل تسلیمی پر خصوصی طور سے شائع ہوا تھا۔ بچوں کے بڑے ادیبوں کا تعارف بھی بہت عمدہ ہے۔ ننھے فنکار کے تحت بچوں کی کہانیاں نہیں دکھلائی دیتیں۔ تاریخی مضمون قلعہ دولت آباد بہت اچھا لگا۔ اس شمارے کے ایک خط میں انعامی مقابلے شروع کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ ان کی رائے بہت زبردست ہے، امید ہے کہ ذمہ داران اس سلسلے میں غور فرمائیں گے۔

سحر اسعد، بنارس، یوپی

اکتوبر 21 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر شائع تصویر دیدہ زیب ہے۔ شمارے میں اسرار الحق سبیلی (وقت کی چوری)، محمد طارق (ویران قلعے کے کبوتر) کی اور زیب النسا (کالے چشمے کا راز) کہانیاں اچھی لگیں۔ اداریہ بچوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ نظمیں بھی لائق ستائش ہیں۔ دیگر تخلیقات بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔

معین الدین شمسی، گریڈیہ، (جھارکھنڈ)

کافی: ایک دلچسپ کھوج

سلمیٰ یوسف حسین

آج کا زمانہ کافی کا زمانہ ہے۔ چھوٹے بڑے شہروں میں اَن گنت کافی کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ بزرگ یہاں وقت گزاری کے لیے آتے ہیں تو جواں سال تفریح کے لیے الغرض کافی کلچر اب ہمارے ملک کا اٹوٹ حصہ بن گیا ہے۔کافی کے رسیا ایک پیالی کافی پر گھنٹوں گزار دیتے ہیں۔

کافی ہم تک کیسے پہنچی یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ کہتے ہیں کالدی نامی ایک چرواہے کی بکریوں نے آس پاس لگی جھاڑیوں سے کچھ بیج کھالیے اور دیکھتے ہی دیکھتے وجد میں آکر کودنے لگیں۔ چرواہا کالدی بکریوں کی اس حرکت سے بڑا پریشان ہوا۔آگے بڑھ کر اس نے بھی ایک بیج چبا ڈالا اور وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار ہوا۔ یہ تھا کافی کا بیج جس میں سرور انگیز کیفیات پائی جاتی ہیں۔آج بھی جب بدن میں خون کا فشار کم ہوجاتا ہے کافی کی ایک پیالی خون کے فشار کو اوپر لانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

15 ویں صدی میں بابا بودن نامی ایک فقیر عربستان کے ملک یمن سے کافی کے سات بیج کمر بند میں چھپا کر ہندوستان لے آئے۔ بابا بودن کا بود و باش ہند جنوبی شہر میسور تھا۔ کچھ سرمایہ داروں نے چھوٹے پیمانے پر کافی کی زراعت کا آغاز کیا اور 1840 میں پہلی بار ہندوستان کے جنوبی علاقے کرناٹک میں کافی کی زراعت اور پیداوار بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔ جلد ہی ہند جنوبی کے دوسرے علاقے تمل ناڈو اور کیرالا بھی کافی کی گرفت میں آگئے۔ 19ویں صدی میں انگریزوں نے کافی کی زراعت کو بڑھاوا دیا اور کافی تجارت کا اعلیٰ وسیلہ بن گئی۔ کافی آج بھی ہند جنوبی کے لوگوں کا محبوب مشروب ہے۔ ان کی صبح کافی کی پیالی سے ہوتی ہے اور شام بھی اسی کے ساتھ۔ یہ تھکن کو دور کرنے کا بہترین علاج ہے۔

1870 میں چائے کی مقبولیت نے کافی کی تجارت پر گہرا اثر ڈالا، لیکن سرکاری امداد نے حالات پر قابو پایا اور کافی کی زراعت کو برقرار رکھا۔

1940 میں پہلا کافی ہاؤس وجود میں آیا لیکن 1950

میں سرکاری پالیسی کے تحت کافی ہاؤس بند ہو گئے اور کام کرنے والے بیکار، لیکن کام کرنے والوں نے ہمت نہیں ہاری اوراے کے گوپالن کی رہبری میں کافی ہاؤس چلانے کی ذمے داری اپنے سر لے لی اوراس طرح ملک میں پھیلی خصوصاً ہند جنوبی کے کافی ہاؤس پھر ایک بار زندہ ہو گئے۔

27 اکتوبر 1957 میں ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں پہلے کافی ہاؤس کا افتتاح ہوا۔ جولوگوں کے میل جول کا محبوب اڈہ بن گیا۔ یہ کافی ہاؤس آج بھی موجود ہے اور دلی کے لوگوں کے ملنے جلنے کا بہترین مرکز ہے۔

1511 میں مکہ کے گورنر خیر بیگ نے عربستان میں کافی کے استعمال پر روک لگانے کی ان تھک کوشش کی لیکن سرانجام کامیاب نہیں ہوا۔

17 ویں اور 18 ویں صدی کے کافی خانے آج کے کافی خانوں سے بے حد مختلف تھے۔ یورپ میں انھیں Penny Uniyersity کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ یہ کافی خانے ادبی اجتماع کا مرکز اور روشن خیال لوگوں کی آپسی ملاقات کا مرکز تھے۔ ایک پینی میں ایک پیالی کافی اور گھنٹوں کے مذاکرات نقصان کا سودا نہ تھے۔ 1674 میں لندن کی خواتین نے کافی خانوں کی بڑھتی شہرت کے خلاف آواز اٹھائی کہ یہ کافی خانے گھر کے مردوں کو لمبے وقت کے لیے گھر سے باہر رکھتے ہیں۔ 1975 میں کرسمس سے دو دن پہلے چارلس بادشاہ نے انگلینڈ میں کافی کے استعمال پر پابندی لگا دی لیکن دو ہفتے کی قلیل مدت میں اسے اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔

کافی کا یہ چھوٹا سا بیج دنیا کے ظلم وستم سہتا آگے بڑھتا گیا اور آج اسے دنیا بھر کی مقبولیت حاصل ہے۔ جاپان جسے چائے کی تہذیب کا مرکز سمجھا جاتا ہے آج وہاں کے لوگ چائے سے ہٹ کر کافی کے دلدادہ ہیں۔

اس کی مقبولیت کی اور بھی وجوہات ہیں۔ کافی کی ایک پیالی آپ کو 11 فیصد وٹامن B-2، 4 فیصد وٹامن B5، 3 فیصد میگنیز اور 2 فیصد میگنیزم دیتی ہے۔ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بدن میں چربی کم کرنے میں مددگار ہے اور جگر کے لیے فائدہ مند ہے۔

آج ہندوستان میں کافی کی 16 قسمیں ہند جنوبی کے 13 حصوں سے حاصل کی جاتی ہیں اور جدید طرز کے بنے کافی خانے گلی گلی، نکڑ نکڑ پر موجود ہیں اور ہندوستانی تہذیب کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔ چلو کافی پر ملتے ہیں یا پھر کافی کا ایک کپ ہو جائے۔ آج کی زندگی کا معمول ہے۔ چلو ہم بھی چلتے ہیں پھر ملیں گے کافی پر!!

[تعارف مئی 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں]

■

Salma Yusuf Husain
E-52, Suncity, Sector - 54
Gurgaon- 122003 (Haryana)

سورج بنام کورونا

سید شمیم احمد مدنی

سید شمیم احمد مدنی کا تعلق کرہ سادات، ضلع فتح پور (ہسوہ) یوپی سے ہے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے جغرافیہ میں ایم اے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ جمشید پور ٹاٹا نگر جھارکھنڈ میں تعلیم و تدریس سے وابستہ رہے۔ جغرافیائی موضوعات سے ان کی خاص دلچسپی ہے اور سائنسی مضامین پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی تخلیقات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

سابقہ ایک سال یا اس سے کچھ زیادہ مدت سے ساری دنیا ایک نئے مرض میں مبتلا ہے جس کے سبب ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ موت کے شکار ہو چکے ہیں۔ اس مرض کا نام کورونا رکھا گیا ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس مرض کا تعلق سورج کی اس بالائی فضا سے ہے جس کو CORONA کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نام چین سے درآمد ہوا ہے جس کو ساری دنیا نے قبول کرلیا ہے۔ مگر دراصل یہ طب کی اصطلاح ہے جو latin زبان کے لفظ Coronum سے مشتق ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Coronation کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی تاجپوشی یا کسی چیز پر چھا جانے کے ہیں۔ علم طب میں اس اصطلاح کا استعمال اس مرض کے لیے ہوتا ہے جو انسانی جسم کے عمل تنفس (Breathing system) کو اپنی گرفت میں لے کر اس کو معطل کر دیتا ہے جس کے باعث موت واقع ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ آگے ہم اس Corona

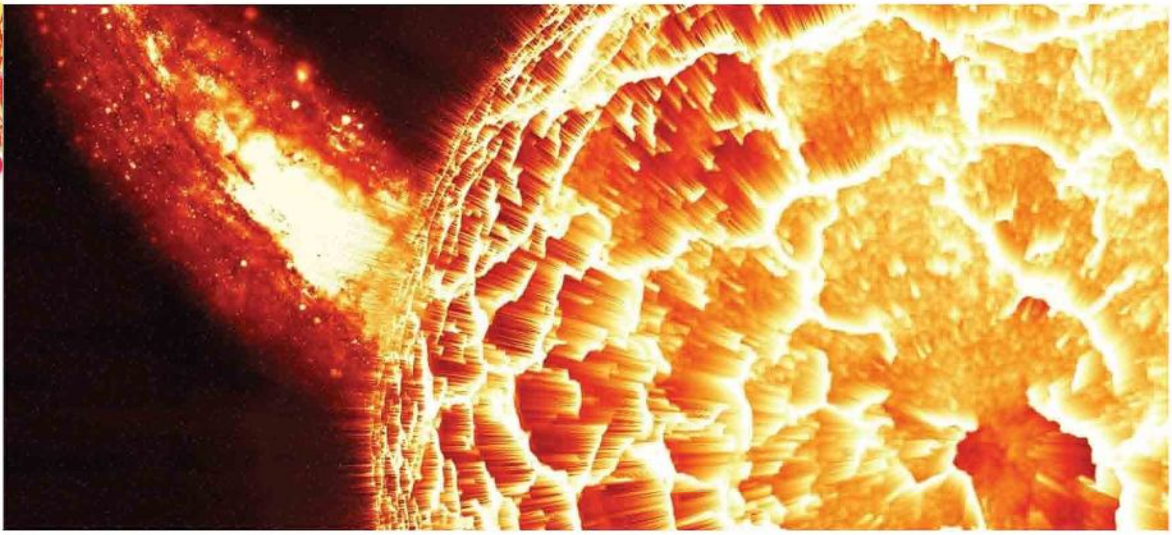

کی بات کریں گے جو Astrophysics کا موضوع ہے اور جس پر NASA کے سائنٹسٹ تحقیق کر رہے ہیں۔

ہمارے سروں پر کروڑوں کیلومیٹر دور افلاک یا خلا (Space) میں اِس سرے سے اُس سرے تک رات کی تاریکی میں چمکتے ٹمٹماتے تاروں کا ایک لا متناہی سلسلہ نظر آتا ہے جن کے درمیان مختلف شکلوں میں چمکتا ہوا چاند بھی دکھائی دیتا ہے۔دن کے وقت ساری دنیا کو روشن کرنے والا سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ان سب کے علاوہ خلائی مادوں کے بہت سے ٹکڑے بھی چکر لگاتے رہتے ہیں جن کو ہم شہاب یا شہابیات (Comets) کہتے ہیں۔یہ اگرچہ دکھائی تو نہیں دیتے مگر ان میں سے جب کوئی زمین کی قوت کشش سے متاثر ہو کر زمین کے دائرہ اثر میں آجاتا ہے تو ہوا کی رگڑ سے جل کر ایک روشن لکیر بناتا ہوا خلا ہی میں غائب ہو جاتا ہے۔اسی کو ٹوٹا ہوا تارہ کہتے ہیں۔جلے ہوئے شہاب کا کوئی ٹکڑا زمین پر بھی گر جاتا ہے۔مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔اس سلسلے میں ہمارے مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ آسمان میں ٹوٹتا ہوا تارہ دراصل فرشتوں کے ہاتھوں شیطان کی پیٹھ پر برسنے والے کوڑے کی مار سے پیدا ہونے والی وہ چمک ہے جب شیطان آسمانوں میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔واللہ عالم۔

اب سورج کے بارے میں بھی کچھ جانکاری حاصل کر لی جائے۔سورج جلتی ہوئی ہائڈروجن گیس کا ایک بہت بڑا گولہ ہے۔ہائڈروجن گیس کے جلنے سے ہیلیم (Helium) گیس بنتی ہے۔اس عمل سے بے انتہا حرارت (Heat) پیدا ہوتی ہے جو برقی مقناطیسی لہروں (Electro-magnetic waves) کی شکل میں سورج سے نکل کر خلا (Space) میں پھیلتی ہے اور ہماری زمین تک بھی پہنچ کر اس کو اور اس کی فضا کو گرم کرتی رہتی ہے۔ان ہی لہروں کو شعاع کہتے ہیں جن کی رفتار تین لاکھ کیلو میٹر فی سکنڈ ہے۔زمین تک پہنچنے میں ان کو ساڑھے آٹھ منٹ درکار ہوتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ سورج نکل چکا ہوتا ہے مگر ہم کو ساڑھے آٹھ منٹ کے بعد ہی دکھائی دیتا ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ سورج کی سطح سے برقی مقناطیسی لہروں کی شکل میں گرمی کے اخراجی عمل کو ارتعاش شمس یا Solar radiation کہتے ہیں۔یہ ارتعاش چھوٹی بڑی سات رنگوں کی لہروں کی شکل میں ہوتا ہے۔سب سے چھوٹی لہر الٹرا وائلیٹ (Ultra violet) اور سب سے بڑی انفرا ریڈ (Infra red) ہے۔پہلی والی نہایت گرم ہوتی ہیں

اتنی کہ اگر پوری کی پوری زمین تک پہنچ جائیں تو منٹوں میں سب کچھ جھلس جائے گا۔ اس سے گلوبل وارمنگ (Global warming) کا خدشہ ہے جس سے فضا اتنی گرم ہو جائے گی کہ انسانوں اور جانوروں کا جینا محال ہو جائے گا۔ انسانی جسم کی نشو ونما متاثر ہوگی۔ پودے خشک ہو جائیں گے۔ جلدی کینسر کی بیماری عام ہو جائے گی۔ پہاڑوں، نیز آرکٹک اور انٹارک ٹک کے برفیلے سمندروں کی ساری برف پگھل جائے گی۔ پہاڑوں کی برف پگھل جانے سے پہلے ندیوں میں سیلاب کی آفت ہوگی، پھر ندیوں میں پانی عنقا ہو جائے گا۔ برفیلے سمندروں کی برف پگھلنے سے سمندروں کی سطح سے کئی میٹر بلند ہو جائے گی۔ جس سے سمندروں کے ساحلوں پر صدیوں سے بسی سیکڑوں بستیاں اور شہر غرقاب ہو جائیں گے۔ مگر خوش قسمتی سے قدرت نے زمین کے اوپر بلندی میں اوزون نامی گیس کا ایک غلاف پھیلا رکھا ہے جو ان ہلاکت خیز الٹراوائلیٹ (Ultra Violet) شعاعوں کو راستے ہی میں روک کر ان کو بے اثر کر دیتا ہے۔ سورج کی ان سات شعاعوں میں انفرا ریڈ لہریں طوالت میں سب سے بڑی ہوتی ہیں جن سے صبح وشام آسمان کا رنگ گلابی ہو جاتا ہے۔

سائنسدانوں کے مطابق زمین سے سورج کی دوری لگ بھگ 15 کروڑ کیلو میٹر ہے۔ اس کا قطر (diameter) 13 لاکھ 90 ہزار کیلو میٹر اور اس کا ایک دن زمین کے پچیس برس نو گھنٹوں کے برابر ہوتا ہے۔

اب تک کی تحقیق کے مطابق سورج کے اندر گہرائی میں درجہ حرارت ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ڈگری سیلسیس ہے جب کہ سطح پر صرف 5,500 ڈگری ہی رہتا ہے۔ مگر دیکھا یہ جاتا ہے کہ سورج کی سطح سے کافی بلندی پر درجہ حرارت پانچ لاکھ ڈگری سیلسیس ہوتا ہے جو سطح کے مقابلے بہت زیادہ ہے۔ یہ ایک معمہ تھا جس کو سائنسدانوں کی ایک ٹیم بہت دنوں سے حل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چنانچہ نومبر 2019 میں اس ٹیم نے اس معمے کو حل کر دکھایا۔ اس دریافت کا سہرا امریکہ کی ان بارہ افراد کی ٹیم کے سر بندھتا ہے جس میں دو بھارتی سائنس داں (Astrophysicists) دیپانکر بنرجی (Dipankar Banerjee) اور تنموائے مہانتا (Tanmoy Mahanta) بھی شامل تھے۔

یہ بات تو پہلے ہی ثابت ہو چکی ہے کہ سورج میں ایٹمی دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ ان کو Solar eruptions کہا جاتا ہے۔ ان دھماکوں سے بے انتہا گرم لہریں پیدا ہو کر سو کیلو میٹر فی سکنڈ کی رفتار سے نو دس ہزار کیلو میٹر کی بلندی تک پہونچ جاتی ہیں۔ یہ لہریں نہیں بلکہ آگ کے انتہائی گرم شعلے ہوتے ہیں جن کو Spicules کہا جاتا ہے۔ ان شعلوں سے وہاں کا درجہ حرارت لگ بھگ پانچ لاکھ ڈگری سیلسیس ہو جاتا ہے۔ سورج کے گرد سطح سے نو دس ہزار فٹ بلند Spicules کی اسی فضا کو کورونا کہا جاتا ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ سورج میں ایسے دس لاکھ دھماکے ہر پانچ دس منٹ میں متواتر ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ سورج کی سطح کے مقابلے اس کی فضا کی بلندی پر درجہ حرارت کی زیادتی کا یہی سبب دریافت کیا جا سکا ہے۔

واضح رہے کہ یہ انکشاف امریکہ نے نومبر 2019 میں کیا ہے۔ امریکہ کے موقر میگزین Science کے شمارہ نومبر 2019 میں یہ مضمون پڑھا جا سکتا ہے۔

■

Syed Shamim Ahmad Madni
5, Cross Road, 10/A
Azad Nagar, Manngo, Town
Jamshedpur - 831012 (Jharkhand)
Mob.: 8969850416

آلودگی کے نقصانات

ناظمہ پروین

ناظمہ پروین بچوں کی معروف ادیبہ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کو بچوں کے ادب کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ ان کا ایک اشاعتی ادارہ 'ہنی بکس' کے نام سے ہے جہاں سے بچوں کے ادب پر بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی بھی 6 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ 'سائنس کے دلچسپ حقائق' ان کی پہلی کتاب تھی۔ اس کے بعد 'کیوں اور کیسے'، 'ناقابل یقین مگر سچ'، 'بچوں کے رابندر ناتھ ٹیگور'، 'دلچسپ معلومات'، 'دلچسپ سائنس اور بچوں کے لیے حیرت انگیز سائنس' کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کتابوں پر انھیں دہلی اردو اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمی سے ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ادبی حلقے میں ان کتابوں کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوئی ہے۔

دنیا بھر میں صوتی آلودگی کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا جا رہا ہے اور اس سے بچنے اور اس کے باعث ہونے والے نقصانات کو کم سے کم کرنے کی تدابیر کی جا رہی ہیں۔ لیکن شہروں کے پھیلاؤ، بڑھتا ٹریفک اور نئی نئی صنعتیں صوتی آلودگی کو بڑھا رہی ہیں۔

صوتی آلودگی

زندگی کے لیے آواز کی خاص اہمیت ہے۔ ہم بول چال کے ذریعے اپنے خیالات اور ضروریات کا اظہار کرتے ہیں۔ موبائل فون کی گھنٹی، گاڑیوں کا ہارن، صبح نیند سے جاگنے کے لیے الارم، عبادت گاہ سے آتی آواز، مرغے کی بانگ اور پرندوں کی سریلی آوازیں ہماری زندگی کا حصّہ ہیں۔

تصوّر کیجیے اگر دنیا سے آوازیں ختم ہو جائیں تو کیسا لگے گا؟ یہ بات وہ افراد بہت اچھی طرح جانتے ہیں جو بے چارے سننے سے معذور ہیں۔ انہیں کتنی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہم اس کا احساس بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن یہی آوازیں اگر شور بن جائیں تو وبال جان بن جاتی ہیں۔ انسان شور کو

برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ گھبرا جاتا ہے اور اس کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی تقریب میں زور زور سے ڈیک پر گانے بجائے جائیں، سڑک پر گاڑیوں کا شور یا آس پاس تعمیر ہونے والی عمارت سے توڑ پھوڑ اور مشینوں کی آوازیں، کتّے کا لگاتار بھونکنا، ہوائی جہاز، ہیلی کاپٹر اور ریل گاڑی کے گزرنے کی آوازیں انسان کو ناگوار لگتی ہیں۔ انہیں ہم ایک حد تک تو برداشت کرسکتے ہیں اس کے بعد یہ ہمارے کانوں کے راستے دل و دماغ کو متاثر کرنے لگتی ہیں اور ہم پریشان و بے چین ہوجاتے ہیں۔

آواز کو ڈیسی بل (db) میں ناپا جاتا ہے۔ انسان 115 ڈیسی بل تک آواز برداشت کرسکتا ہے۔ اگر یہ آواز 115 ڈیسی بل سے زیادہ ہوئی تو انسانوں اور دوسرے جان داروں کے لیے نقصان دہ بن جاتی ہیں۔ یورپ اور دیگر ترقی یافتہ ممالک میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ شور اتنا نہ ہو کہ وہ انسانوں کے لیے ناقابل برداشت بن جائے۔ عالمی ادارہ صحت نے کارخانوں اور صنعتوں کے لیے 75 ڈیسی بل پیمانہ طے کیا ہے۔

ہمارے شہروں میں ترقی کے ساتھ ساتھ صوتی آلودگی بڑھ رہی ہے۔ ٹریفک کا شور، لاؤڈ اسپیکر، ٹیلی ویژن، موبائل فون، عمارتوں کی تعمیر، جہازوں اور ریل گاڑیوں کی آمد و رفت نے مل کر صوتی آلودگی کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ لوگوں کو بہرے پن سے لے کر دماغی تناؤ، بے چینی، نیند نہ آنا اور امراض قلب جیسی تکالیف بڑھ رہی ہیں۔

دنیا بھر میں صوتی آلودگی کو ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا جارہا ہے اور اس سے نپٹنے اور اس کے باعث ہونے والے نقصانات کو کم سے کم کرنے کی تدابیر کی جارہی ہیں۔ لیکن شہروں کے پھیلاؤ، بڑھتا ٹریفک اور نئی نئی صنعتیں صوتی آلودگی کو بڑھا رہی ہیں۔ خاص طور پر ترقی پذیر اور غریب ممالک میں اس آلودگی پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ اس کا برا اثر پرندوں اور جانوروں پر پڑ رہا ہے جس کے سبب ان کی افزائش نسل نہیں ہو پا رہی ہے۔ یہاں تک کہ سمندر میں چلنے والے جہازوں اور تیل نکالنے کی مشینوں سے مچھلیوں کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔

صوتی آلودگی کی طرح مٹی کی آلودگی بھی صنعتی انقلاب کے بعد وجود میں آئی یہ بھی دنیا کا قابل تشویش مسئلہ ہے۔ بڑھتی ہوئی صنعتوں، کان کنی، ٹرانسپورٹ اور خاص طور پر ہوائی ٹرانسپورٹ نے اس مسئلے کو سنجیدہ کردیا ہے۔ اس سے زمین پر پائے جانے والے تمام جانداروں بشمول انسانوں اور پیڑ پودوں کی صحت پر خراب اثرات ہورہے ہیں۔

سچ مچ صوتی آلودگی نئے دور کا ایک بڑا چیلنج بن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔

مٹی کی آلودگی

صوتی آلودگی کی طرح مٹی کی آلودگی بھی صنعتی انقلاب کے بعد وجود میں آئی یہ بھی دنیا کا قابل تشویش مسئلہ ہے۔ بڑھتی ہوئی صنعتوں، کان کنی، ٹرانسپورٹ اور خاص طور پر ہوائی ٹرانسپورٹ نے اس مسئلے کو سنجیدہ کردیا ہے۔ اس سے زمین پر پائے جانے والے تمام جانداروں بشمول انسانوں اور پیڑ پودوں کی صحت پر خراب اثرات ہورہے ہیں۔

حالانکہ مٹی کی ساخت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اس میں آلودگی بڑھانے والے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ ان عناصر

میں خاص طور پر دھاتیں، غیر نامیاتی برق پارے فاسفیٹ، کاربونیٹ، سلفیٹ اور نائٹریٹ جیسے نمکیات ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ نامیاتی کمپاؤنڈ بھی پائے جاتے ہیں جن میں پروٹین، ڈی این اے، فیٹی ایسڈ، ہائیڈرو کاربن، پی اے ایچ ایس اور الکوہل وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

اگر مٹی میں مذکورہ مادوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو اسے مٹی کا آلودہ ہونا کہتے ہیں اور یہ مٹی بجائے فائدے کے پیڑ پودوں، جانداروں بشمول انسانوں کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔

مٹی کی آلودگی کے دو خاص اسباب ہیں: انسانوں کے ذریعے اور قدرت کے ذریعے

انسانوں کے ذریعے مٹی کو زیادہ آلودہ کیا جاتا ہے۔ انسان اپنی سرگرمیوں سے مٹی میں بہت سارے غیر نامیاتی اور نامیاتی مادے شامل کر دیتا ہے۔ کارخانوں سے نکلنے والا فضلہ کھلے میدانوں یا کھیتوں کے آس پاس پھینک دیا جاتا ہے۔ آج فصلوں کو کیڑوں سے بچانے کے لیے اور زیادہ پیداوار کی خاطر مصنوعی کھادوں اور کیمیکل کا استعمال ہو رہا ہے جس سے مٹی آلودہ ہو رہی ہے۔ یہ مادے مٹی میں شامل ہو کر انجانے میں ہمارے جسم میں داخل کر لیے جاتے ہیں اور یہ صحت کے مسائل پیدا کرنے لگتے ہیں۔

قدرت بھی مٹی میں کئی طرح کے زہریلے مادے شامل کرتی رہتی ہے لیکن یہ آلودگی بہت معمولی ہوتی ہے۔ یعنی ماحول میں موجود زہریلے مادے مٹی میں مل جاتے ہیں۔ مٹی کو آلودہ کرنے میں انسانی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر صنعتی کچرہ، گھروں سے نکلنے والا فضلہ، باغات اور کھیتوں میں استعمال ہونے والی جراثیم کش دوائیں اور مصنوعی کھادیں خاص طور پر ذمے دار ہیں۔ اس کے علاوہ تابکاری سے بھی مٹی پر اثر پڑتا ہے۔ بڑھتی آبادی کے سبب شہرکاری (Urbniztion) کا عمل بھی اثر کرتا ہے۔ شہروں میں تعمیر ہونے والی عمارتوں میں مختلف کیمیائی مادے اور رنگ روغن استعمال ہوتے ہیں اور بڑی تعداد میں ملبے اور کچرے کی شکل میں انہیں لینڈفل یا کھلے میدانوں میں پھینک یا دفن کر دیا جاتا ہے۔ ان زہریلے مادوں سے مٹی ہی نہیں زیر زمین پانی بھی گندا ہو جاتا ہے۔ صنعتوں اور تعمیرات میں یہ نقصان دہ مادے استعمال ہوتے ہیں جو مٹی کو بری طرح آلودہ کر دیتے ہیں۔ جستہ، پارہ، آرسینک، تانبہ، زنک، نکل اور PAHS (Polyaromatic Hydrocarbons) اور کیڑے مار دوائیں شامل ہیں۔

آلودہ مٹی پیڑ پودوں، جانوروں اور انسانوں کو یکساں متاثر کرتی ہے۔ جو جاندار مادے اس کا جلدی اثر قبول کرتے ہیں وہ صحت کے مسائل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ مٹی میں موجود نقصان دہ مادے سانس کے ذریعے، پانی کے ذریعے، مٹی سے خارج ہونے والی گیس کے ذریعے یا مٹی کے رابطے میں آنے سے انسانی جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ بچے اس سے جلدی متاثر ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ باغوں، میدانوں یا مٹی میں کھیلنا پسند کرتے ہیں۔ جو لوگ کارخانوں، لینڈفل یا ہوائی اڈوں کے قریب رہتے ہیں ان پر مٹی کی آلودگی کا جلدی اثر پڑتا ہے۔

صنعتی دنیا کا یہ ایسا مسئلہ ہے جس سے مشترکہ طور پر ہی کسی حد تک بچا جا سکتا ہے حکومتیں اور غیر سرکاری تنظیمیں اس سمت لوگوں کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن یہ گمبھیر مسئلہ ہے جو دن بہ دن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ■

Nazima Parveen
2793, Pahari Bhojla
Delhi - 110006

حارث حمزہ لون

امتحان کی آمد: طلبا امتحان کس طرح دیں

ہوئے ختم اب تو ہمارے مزے
کہ ہیں امتحان اپنے سر پر کھڑے
مدد کی توقع کسی سے نہیں
ہوئے سارے روپوش ساتھی کہیں
کریں بھی تو فریاد کس سے کریں
کسے دوست دنیا میں اپنا کہیں
پڑھا جس نے وہ ہوگیا کامیاب
ترقی ملی اس کو بس بے حساب
سمجھ میں یہ آیا کہ محنت کریں
فقط ہم کتابوں سے اُلفت کریں

بچو، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ زندگی بذات خود ایک امتحان ہے اور انسان زندگی بھر مختلف طرح کے امتحانوں سے گزر کر کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اکثر طلبا کافی محنت کرتے ہیں کتابیں پڑھتے ہیں۔ خلاصے یاد کرتے ہیں اور بڑی تیاری سے امتحان میں شریک ہوتے ہیں لیکن جب نتیجہ آتا ہے تو وہ خلاف توقع ناکام ہوجاتے ہیں، ان کی سال بھر کی محنت رائگاں جاتی ہے۔ طلبہ پھر اپنی قسمت کو برا کہتے ہیں۔ جبکہ ایسی بات نہیں ہے۔ طلبہ اگر غور کریں تو انھیں اس میں اپنی کوتاہی اور خامی نظر آئے گی۔

بات دراصل یہ ہے کہ امتحان دینا بھی ایک فن ہے اور اکثر طلبہ اس فن سے ناواقف ہوتے ہیں، انھیں امتحان دینے کا طریقہ نہیں آتا۔ امتحان کی تیاری کبھی اس وقت شروع نہ کریں جب امتحان سر پر آنے کو ہو۔ اس عمل سے گھبراہٹ، انتشار اور پریشانی کی وجہ سے صحیح تیاری نہیں ہو پاتی اور یہ ضرب المثل ہر کسی کو یاد ہی ہوگی کہ ''جلدی کا کام شیطان کا۔'' اس لیے ہمیشہ یہ یاد رکھیں کہ پہلے کل نصاب اپنے سامنے رکھیں۔ کاغذ اور قلم ہاتھ میں لیں اور اس بات کا تعین کریں کہ اس کتاب کو کتنے عرصے میں مکمل کیا جاسکتا ہے۔ پھر وقت کو مناسب طریقے پر تقسیم کرکے کاغذ پر نصاب کو مکمل کرنے کے لیے ہر پرچے کے لیے الگ الگ مقرر کرکے لکھیں، اس پروگرام پر عمل کرکے امتحان کے لیے تیاری کریں۔

امتحان کی تیاری کے معنی عام طور پر صاف پڑھنا یا رٹنا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ تیاری میں لکھنے کی مشق کرنا ضروری ہے۔ اس لیے جب بھی آپ کسی سبق یا مضمون کو پڑھتے جائیں تو اس دوران اہم نکات کو نوٹ کرتے

جائیں پھر کتاب بند کر کے ان نکات کی مدد سے وہی مضمون اپنے الفاظ میں لکھنے کی کوشش کریں۔ اس طرح مطالعے کے ساتھ ساتھ تحریر کی مشق بھی ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ مطالعے میں نظر اور ذہن کی مصروفیت ہے کیونکہ تحریر کے عمل میں ذہن کو عملی طور حاضر رہنا پڑتا ہے۔ اس طرح توجہ اور ذہنی کاوش سے مطلوبہ متن کو نوک قلم کے ذریعے صفحہ قرطاس پر لایا جاسکتا ہے۔ تحریر کی مشق آپ کو ان خامیوں سے بھی بچائے گی جو آپ امتحان میں کر بیٹھتے ہیں مثلاً املا کی غلطیاں، تذکیر و تانیث کی غلطیاں، صیغے اور زمانے کی غلطیاں، سوال کا مقصد نہ سمجھنے کی غلطی اور عبارت کی بے ربطی وغیرہ۔

امتحان کا وقت ایک آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اچھے اور ذہین طلبہ پر بھی امتحان کے وقت گھبراہٹ طاری ہوتی ہے اور اس اضطراب اور گھبراہٹ میں وہ لکھنا کچھ چاہتے ہیں اور لکھ کچھ جاتے ہیں۔ حافظہ جواب دے جاتا ہے اور ذہن بھی کسی حد تک بیکار ہو جاتا ہے۔ امتحان کے موقعے پر سب سے پہلی اور اہم چیز جو طالب علم کے لیے ضروری ہے وہ حاضر دماغی اور سکون قلب ہے۔ جب کمرہ امتحان میں داخل ہو تو نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ داخل ہو۔ دماغ پر کسی قسم کی فکر اور بار نہ ہو۔ تازہ دم ہو کر پرچہ حل کرنے کے لیے سیٹ پر بیٹھنا چاہیے اور سوال نامے پر لکھی ہوئی ہدایات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے، اُن میں سے کتنے سوالوں کا جواب آسانی سے دیا جاسکتا ہے جو سوال یادداشت کے اعتبار سے سب سے زیادہ آسان ہوں اور جن کے متعلق دماغ میں کافی مواد ہو سب سے پہلے اُس کو حل کرنا چاہیے کیونکہ سوالات کا بالترتیب حل کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے۔ آسان سوالوں کو پہلے حل کرنا چاہیے تاکہ وقت بھی کم صرف ہو اور دماغ بھی بوجھل نہ ہو۔ جوابات صاف، خوش خط اور دلچسپ عبارت میں ایسے انداز سے تحریر کرنے چاہیں کہ ممتحن آپ کی تحریر کی روانی اور شگفتگی سے محظوظ ہو۔ جوابات وقت کا اندازہ کرتے ہوئے ایسی رفتار سے لکھے جائیں کہ تین گھنٹے میں مکمل ہوسکیں۔ جوابات میں بے جا طوالت اور عنوان سے ہٹ کر طویل بحث بالکل نہ ہونی چاہیے۔ خیالات درست، صاف ستھرے اور ترتیب سے ہوں۔ جملے مختصر ہوں، طویل نہ ہوں۔ مضمون پیراگرافوں میں منقسم ہو۔ پرچہ مکمل کر لینے کے بعد ایک مرتبہ جوابات پر نظر ثانی کر لینا بھی ضروری ہے، تاکہ عجلت میں اگر کچھ الفاظ لکھنے سے رہ گئے ہوں تو وہ لکھے جاسکیں۔

امتحانی سوال کا جواب لکھنے سے پہلے چند منٹ غور کر لینا چاہیے اور سوال کے لیے اشارات نوٹ کر لینے چاہیے۔ اگر کسی مسئلے میں ممتحن آپ سے رائے طلب کرتا ہو تو آپ کو چاہیے کہ بغیر کسی جھجک اور تامل کے اپنی صحیح رائے جو اس سلسلے میں ہو، لکھ دینی چاہیے۔ خواہ وہ دوسروں کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، لیکن آپ کا جواب مدلل ہونا ضروری ہے۔ اس سے ممتحن آپ سے متاثر ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ ممتحن کے متاثر ہونے کے بدلے آپ کو کیا ملے گا؟ نمبرات زیادہ اور امتیازی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

الغرض امتحان میں صفائی اور جوابات کی تکمیل کا پورا پورا لحاظ رکھیے اور ایسی چیز نہ لکھ دیجیے جس سے ممتحن کے دماغ پر برا اثر پڑے۔ اگر ہم صرف ان مشوروں پر ہی عمل کریں گے تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ہمیں کامیابی ضرور ملے گی۔

■

Haris Hamzah Lone
Kashmir R/O: RehmatAbad RafiAbad
Baramulla
Post Office: Watergam- 193303 (J&K)
Mob.: 7889382310

ایسا تھا بچپن

حیدر بیابانی

حیدر بیابانی ادب اطفال کے ایک اہم شاعر، ادیب تھے۔ بچوں کے ادب پر ان کی تقریباً 50 سے زائد تصانیف ہیں۔ وہ ادب اطفال کا ایک روشن حوالہ تھے۔ ان کی شخصیت اور خدمات پر ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی بھی ہوچکی ہے۔ وہ 1 جولائی 1948 کو اچلپور امراوتی مہاراشٹر میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ ان کی تقریباً 60 نظمیں نصاب میں بھی شامل ہیں ۔ مہاراشٹر، بہار، یوپی، ہریانہ، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں نے بھی ادب اطفال میں ان کی اہم خدمات پر اعزازات سے نوازا ہے۔ بچوں کے رسائل میں ان کی تخلیقات نہایت اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' سے بھی ان کا ایک گہرا رشتہ تھا۔ 'میرا بچپن' کالم کے لیے ان سے درخواست کی گئی تھی، تو انھوں نے 'ایسا تھا بچپن' کے عنوان سے یہ مضمون 5 اگست 2021 کو ارسال کیا تھا۔ مگر افسوس کہ ان کی زندگی میں یہ مضمون شائع نہ ہوسکا، حیدر بیابانی 19 جنوری 2022 کی صبح اچلپور (مہاراشٹر) میں انتقال کر گئے۔

بچپن کا زمانہ میرے لیے بڑا خوبصورت، یادگار اور من موہنا رہا، اسی لیے میں نے اپنی پہلی کتاب 'ننھی منّی باتیں اول' کا پیش لفظ یوں تحریر کیا تھا کہ ''بچپن میرے لیے ایک خوشگوار لیکن تیز رفتار ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھا جو آیا اور گزر گیا اور میں صرف غبار دیکھتا رہ گیا..... اور اب وہ بچہ جو بچپن کی جنت گمشدہ کی تلاش میں ہے میرے اندر اچھلتا مچلتا، ہنستا مسکراتا، گیت گاتا گنگناتا، کہانیاں سنتا اور کہانیاں بنتا ہے۔ 'ننھی منّی

باتیں، اسی اندرونی عمل کا ردِعمل ہے۔ یہ مجموعہ بچوں کے لیے ہے اوران سب بڑوں کے لیے بھی اور جو اندر ہی اندر کہیں نہ کہیں ضرور بچے ہیں۔''

بچپن کی یادیں، باتیں اور دلکش وارداتیں آج بھی میرے اپنے ذہن میں انمول خزانوں کی شکل میں موجود ہیں جو نظموں اور گیتوں کی صورت باہر نکلتے جا رہے ہیں۔ محاورتاً کوئی کوئی بچہ اپنے منھ میں سونے چاندی کا چمچہ لیے ہوئے پیدا ہوتا ہے کچھ ایسے ہی معاملات میرے ساتھ ہوئے ہیں۔ والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے بڑے شاندار طریقے سے پرورش ہوئی کھاتے پیتے گھر کی اولاد ہوں، بڑا سا گھر، کھیتی باڑی، نوکر چاکر، گائیں بھینسیں، بکریوں اور مرغیوں سے بھرے پرے باڑے سب کچھ تھا بچپن میں.....

مضمون 'حیدر میرا دوست' میں سید غلام علی بیابانی یوں لکھتے ہیں'' حیدر بیابانی میرے دوست ہیں، ان کی اور میری دوستی کالج کے زمانے کا بیش قیمت تحفہ ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو میں انھیں بچپن سے جانتا ہوں، ہم دونوں ایک ہی شہر ایک محلے کے پلے بڑھے ہیں، عمر میں میں ان سے چند سال بڑا ہوں اس لیے زمانۂ طفلی میں ان کے اور میرے درمیان ایک حد فاضل رہی۔ ان کی اور میری ہم نشینی نہ اسکولی جماعتوں میں رہی اور نہ کھیل کے میدانوں میں، ہم ایک دوسرے کے مدِمقابل رہے لیکن ان کا پلنا بڑھنا، کھیلنا کودنا، پڑھنا لکھنا سب کچھ میری نظروں کے سامنے ہوتا رہا، یہی وجہ ہے کہ میں ان کے، عادات واطوار اور ذہنی معیار سے واقف ہوں۔ حیدر بیابانی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے اس لیے بچپن ان کا بڑا عالیشان گزرا۔ کھیتی باڑی، باغ بغیچے اور نوکر چاکر ان کے مقدر کا لکھا تھا لیکن باوجود ہر شے کی فراوانی کے والدین کی سخت گیری ان کی اچھی تعلیم وتربیت میں معاون ثابت ہوئی۔ اپنی ہر جماعت میں اول رہ کر اور اپنی شریفانہ طبیعت کے بدولت ہمیشہ ہی وہ اپنے استادوں اور بزرگوں کے چہیتے بنے رہے۔

حیدر بیابانی بچپن ہی سے بڑی شرمیلی طبیعت کے مالک رہے ہیں، ان کے دوستوں کا حلقہ ہمیشہ محدود رہا۔ کسی بھی اچھی یا بری بات کو دل سے لگا لینا ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ کسی بھی اجنبی سے وہ جلد گھل مل نہیں پاتے۔ اس لیے لوگ انھیں مغرور سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی محبت اور ذہانت کے دروازے کسی پر بہت دیر بعد کھلتے ہیں، ہاں ان کی دلکش شخصیت سے کوئی بھی پل بھر میں متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پاتا۔ کلاس روم میں بھی وہ اپنے ہم جماعتوں سے جلدی نہیں گھلتے ملتے اور نہ استادوں پر ان کے جوہر کھلتے لیکن آہستہ آہستہ سب ہی ان کی شرافت کا لوہا ماننے پر مجبور ہو جاتے.....''

مشہور مزاح نگار بابو آر کے اپنے مقالے 'باتیں حیدر بیابانی کی' میں یوں تحریر فرماتے ہیں کہ'' ہم دونوں ایک دوسرے کو اس وقت سے جانتے ہیں جب ہم آدھی ادھوری ستر پوشی کیا کرتے تھے۔ ہاف پینٹ پہنے اسکول جایا کرتے تھے۔ ان دنوں ہمارے اسکول کی یونیفارم خاکی ہاف پینٹ اور آدھی آستینوں والا سفید شرٹ ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں بھی حیدر بیابانی کا رنگ اجلا اور قد نکلا ہوا تو تھا ہی بعد انھوں نے مزید ہاتھ پاؤں نکال لیے گویا قدرت دونوں ہاتھوں سے فیاضی لٹا کر ان کے سراپے کو نوازنے پر تلی تھی۔ قد کاٹھی ہم جماعتوں میں سب سے الگ تھی۔ ان کی قدوقامت کی تنومندی کے ہم ہمیشہ ہی شاکی رہے ہیں کیونکہ ایسی مضبوط قدو کاٹھی والا کوئی بھی شخص پہلوان، کھلاڑی یا کسی فلم کا ہیرو ہوسکتا ہے اردو کا شاعر و ادیب تو بالکل نہیں... آج بھی حیدر بیابانی کا وجود دہری ہڈی میں فراغت کے ساتھ اجلی مٹی سے گوندھا ہوا لگتا ہے۔''

بچپن میں عیش وآرام کی ہر شے میسر تھی نہ کسی چیز کی کمی نہ کسی بات کی فکر، لیکن پابندیاں حد سے زیادہ ، نہ وہاں مت جاؤ، اتنا تیز مت دوڑو، گلی کے لڑکوں کے ساتھ نہ کھیلو، مٹی دھول میں مت سنو، یہ کھاؤ وہ مت کھاؤ، فلاں چیز کھانے سے کھانسی ہوجائے گی، فلاں چیز نہ کھانے سے کمزور ہوجاؤ گے... اس طرح کی پابندیاں تھیں۔ گھر میں دودھ دہی گھی، باغیچے میں آم، امرود، جامن، سیتا پھل اور بیروں کے بہت سارے پیڑ تھے۔ یہ سب کھاتے پیتے بچپن گذرا اور خوب گذرا۔

خوش قسمتی کا ساتھ ہے بچپن سے آج تک
ہر رات چاندرات ہے بچپن سے آج تک
انگریزی کی ایک لائن ہے I get what I want
جو چاہا وہ ملا مجھے بہتر سے بہترین
ہر بات خاص بات ہے بچپن سے آج تک

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''اچھے انسان کی پہچان یہ ہے کہ اس کے دوست اور ملازم پرانے ہوں۔'' وحید خاں، رحمت اللہ خاں (آر کے بابو) اور یعقوب الرحمٰن میرے ایسے دوست ہیں جو بچپن سے آج تک دوست بنے ہوئے ہیں اور اپنے بچپن کے کچھ ایسے انسان (شیخ رحیم، کریم خاں اور بشیر خاں وغیرہ) ابھی اس دنیا میں موجود ہیں جنھوں نے پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال تک ہمارے گھر پر مستقل ملازمت کی ہے۔

بچپن کے جو بھی دوست تھے اب وہی ہیں دوست
کیا خوب اپنی ذات ہے بچپن سے آج تک

شہر اچلپور میں بیابانی کا علاقہ ہمارے اجداد کی جاگیر کا حصہ تھا، خاندان کے سب سے پہلے بزرگ سید کوشک شاہ اور ان کے بڑے بھائی بڑے شاہ تھے جو باہر ملک سے اچلپور درس وتدریس کے سلسلے میں تشریف لائے تھے۔ بیابانی میں سب سے پہلے قائم مٹی پتھر سے بنی مسجد (جو بعد میں منّو میاں کی مسجد کہلائی) اس سے متصل خانقاہ نما گھر ان بزرگوں کا مسکن رہا۔ گھر سے ذرا فاصلے پر قبرستان جو آج بھی قبروں کی صورت میں موجود ہے اسی جگہ میرا بچپن گذرا اور خوب گذرا پانچ سال کی عمر میں پڑوس کے ماسٹر اکبر صاحب نے ساتھ لے جاکر اپنے لڑکے جلیل احمد کے ساتھ مجھے پہلی جماعت میں داخل کروادیا۔ ہماری والدہ کہتی ہی رہ گئیں ''چچا وہ ابھی سات سال کا نہیں ہوا ہے۔'' لیکن انھوں نے ایک نہ سنی، واضح ہو کہ اس وقت سات سال کی عمر کے بچوں کو ہی پہلی جماعت میں داخل کیا جاتا تھا۔ خیر میری پڑھائی لکھائی کا دور شروع ہوا اور میں جلد ہی استادوں کا منظورِ نظر بن گیا۔ اپنے ہم جماعتوں میں سب سے نمایاں جو تھا۔

پڑھائی میں اول درجے کا، ہر کلاس میں اول نمبر جو آتا تھا۔ اس کے علاوہ شکل وصورت بھی اچھی خاصی تھی۔

اچلپور دو ندیوں (دریائے ساپن اور دریائے بچھن) کے بیچ بسا دوآبہ ہے۔ شہر سے قریب ہی ست پڑا پہاڑ کا سلسلہ ہے شہر دیہی اور شہری دونوں ہی طرح کی زندگیوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہاں چھک چھک کرتی ہوئی نیروگیڈ والی ٹرین بھی چلتی ہے اور سن سن کرتی بسیں اور کاریں بھی، کھیتی کسانی کرتے ہوئے لوگ بھی نظر آتے ہیں اور بڑی کپڑا مل میں کام کرتے مزدور بھی۔ بچپن میں بیلوں کے گلوں میں بجتی ہوئی گھنٹیوں کی آواز بھی سنی اور رنگ برنگی اڑتی ہوئی تتلیوں، پرندوں کی ڈاریں بھی دیکھی ہیں۔ لہلہاتے ہوئے کھیت، جوار، کپاس اور تور کی ہری بھری فصلیں آنکھوں کو ٹھنڈک دیتی تھیں۔ ہمارے گھر بہت سارے جانور تھے، گرمیوں میں جب یہاں چارے کی قلت ہوتی تو دودھ نہ دینے والے جانور پہاڑی علاقے میں بھجوادیے جاتے جہاں

گولی اور گونڈ برادری کی لوگ چند روپیوں کے عوض انھیں چراتے تھے اور ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ وہ لوگ اکثر ہمارے گھر بال بچوں سمیت آتے جاتے تھے۔ خاص کر اس وقت جب ان کے یہاں شادی بیاہ ہوتا خریداری کے لیے یا کوئی بیمار ہوجائے تو اس کے علاج کے لیے... ان کا ٹھکانہ ہمارا گھر ہی ہوتا ان وقتوں میں بڑی گہما گہمی ہوتی۔ وہ آنگن میں چولہے بناتے اور چراغ یا لال ٹین کی روشنی میں کھانا پکاتے، کھاتے اور وہیں بستر بچھا کر سو رہتے۔ ان کے چھوٹے بڑے بچے بچیاں بھی ہوتیں، گولیوں کی نسل تو بہت خوبصورت اور گوری چٹی تھی۔

گویا بچپن بڑے دلار سے، جوانی بڑے پیار سے اور اب بڑھاپا بڑے آرام سے گزر جائے گا لیکن لڑکپن کا زمانہ اب بھی یادوں میں بسیرا کیے ہوئے ہے۔ ایک ایک بات ایک ایک چیز ایک ایک لمحہ جو بہت دل نشین تھا ہر دم ہر پل یادوں میں بسا رہتا ہے اور اس زمانے کی ہر چیز کو مس کرتا رہتا ہے۔

بڑا ہو کر لڑکپن کا زمانہ چھوڑ آیا ہوں

بڑا نقصان کر بیٹھا ہوں کیا کیا چھوڑ آیا ہوں

بچپن میں گھروندے بنا کر اس میں کھیلنا، پڑوسی لڑکیوں کا ساتھ میں گڑیوں سے کھیلنا اور میرا کنچوں سے دل بہلانا یادوں کے جھروکوں سے جھانکتا رہتا ہے۔

وہ گڑیا چھوٹ گئی مجھ سے، وہ گڈا چھوڑ آیا ہوں

گھروندے میں رکھا اک اک کھلونہ چھوڑ آیا ہوں

گھر کے سامنے بڑا سا آنگن تھا، پڑوس کے بچوں کے ساتھ اس میں دوڑا بھاگا جاتا، بارش میں آنگن پانی سے بھر جاتا تو اس میں کاغذ کی ناؤ بنا کر اسے تیرایا جاتا۔

مجھے کاغذ کی اب ناؤ بنانی ہی نہیں آتی

وہاں پانی بھرے آنگن میں نیا چھوڑ آیا ہوں

بچپن میں پریوں کی، ستاروں کی اور چاند ماموں کی کہانیاں بڑا مزہ دیتی تھیں، رات میں چاند کو تکنا، چرخہ کاتتی بڑھیا کو تلاش کرنا، خوابوں میں پریوں کی طرح اڑنا ہر دن رات کا مشغلہ تھا۔

کہانی چاند ماموں کی ہوئی ہے ذہن سے غائب

وہ بڑھیا کھو گئی مجھ سے، وہ چرخہ چھوڑ آیا ہوں

گلی کوچوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی تماشہ ہوتا، کبھی بائسکوپ والا آتا تو شور مچاتے محلے پڑوس کے بچے جمع ہوجاتے، کبھی مداری اپنا بندر اور سانپوں کے پٹارے لے آتا اور طرح طرح کے تماشے دکھاتا مزے دار باتیں کرتا جاتا اور دیکھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجاتے، کبھی بھالو والا اپنا بھالو لیے آتا اور طرح طرح کے بھالو سے کرتب کرواتا۔

ٹھمکتا ناچتا بندر، ڈما ڈم بولتا ڈمرو

محلے میں مداری کا تماشہ چھوڑ آیا ہوں

میں ضدی اور شرارتی بچہ نہیں تھا ہر ضرورت پوری ہوجاتی تو پھر کہاں سے ضدی پن فطرت میں آتا لیکن کبھی ایسے ضد کر بیٹھتا جسے پوری کرنا والدین کے لیے ذرا مشکل ہوتی۔ لیکن وہ اس مشکل کو ضرور آسان بنا لیتے۔ پانچویں جماعت میں تھا کہ کوٹ پینٹ پہننے کی ضد کر بیٹھا والدہ نے سختی سے منع کر دیا، ان کا خیال تھا دن بہ دن چراغ کی جوت کی طرح بڑھ رہا ہے سال بھر میں خود بڑا ہوجائے گا اور سوٹ چھوٹا۔ لیکن والد صاحب نے ایک دن چپکے سے مجھے اور رؤف چچا کو اپنے ساتھ لے کر اس وقت کے سوٹ اسپشلیسٹ اندور کر ٹیلر کے پاس لے گئے، وہاں سوٹ کا ناپ لیا گیا اور سبحان خاں کپڑے والوں کے وہاں سے کپڑا خریدا گیا، اس زمانے میں ٹیری اول یا ٹیری کاٹ کا چلن نہیں ہوا تھا۔ سوتی کپڑا ہی ملتا تھا۔ خیر اندور کر کے پاس کپڑا ڈال دیا گیا۔ اب روزانہ میرا معمول تھا

کہ اسکول کی واپسی پر اندورکر کی دکان کے سامنے سے گذرتا لیکن وہ سلا ہوا سوٹ نظر نہیں آتا۔ ایک دن پھر والد صاحب نے مجھے ساتھ لیا اور رؤف چچا کو گھر سے لیتے ہوئے اندورکر کی دکان پر پہنچ گئے، سوٹ تیار تھا، ٹیلر صاحب نے اسکولی ڈریس کی ہاف پینٹ اتارنے کو کہا اور فل پینٹ پہنا دیا۔ اوپر سے کوٹ پہنایا، ٹیلر نے ایک کپڑے کا بیلٹ بھی بنا دیا تھا۔ ہاف پینٹ کو اخبار میں لپیٹ دیا، اب ہم گھر کی جانب بڑھے والدہ کے ڈر سے والد تو باہر کھڑے رہے اور مجھے گھر کے اندر جانے کو کہا، میں بھی ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوگیا۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ والدہ یک ٹک مجھے دیکھتی ہی رہ گئیں اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ یہ بھی سچ ثابت ہوا کہ والدہ کا اندیشہ بالکل درست تھا، ایک دیڑھ سال کے اندر میرا قد بڑھ گیا اور سوٹ چھوٹا ہوگیا۔ والدہ نے اس سوٹ کو یہ کہہ کر ایک تکیے میں بھر دیا کہ وہ اب اسے اپنے پوتے کو پہنائیں گی۔

نہ وہ ضد ہے، نہ وہ ہٹ ہے، نہ وہ فرمائشیں اپنی
خدا جانے کہاں اندر کا بچہ چھوڑ آیا ہوں

گھر میں دودھ دہی گھی کی بہتات تھی۔ بہت ساری مرغیاں تھی اس وقت گھر کی بنی جوار کی روٹی اور تور کی دال میں بھی بڑی لذت تھی۔ دودھ پینا، دہی کھانا اور ہر روز صبح گھی کا پڑاٹھا یا انڈا کھانا معمولات میں تھا۔

مزہ برگر میں، پزا میں ہے ویسا اب کہاں یارو
توے پر سڑسڑاتا جو پراٹھا چھوڑ آئے ہیں

ندی کنارے ہمارا کھیت ہے لیکن مجھے کبھی تیرنا نہیں آیا کیوں کہ مجھے تیرنے ہی نہیں دیا گیا۔ کھیت میں بڑے بڑے آم اور جامن کے پیڑ تھے لیکن مجھے کبھی پیڑ پر چڑھنا نہیں آیا کیونکہ مجھے کبھی جوکھم بھرے کام کرنے ہی نہیں دیے گئے۔ کھیلوں سے بھی دور رکھا گیا، جبکہ میں خاصا مضبوط بچہ تھا۔ کبھی کبھار کنچے کھیلے تو اول درجے کا نشانے باز ہوا۔ ایک بار دوڑ میں حصہ لیا تو بازی میرے ہاتھ رہی۔ کالج کے زمانے میں NCC ٹریپ سوشل کیمپ کے سلسلے میں دس دن کے لیے پوہرا کے جنگل میں گیا، وہاں ایک دن نشانے بازی ہوئی میں نے کبھی بندوق کیا غلیل سے بھی نشانے بازی نہیں کی تھی وہاں اور لڑکوں کے ساتھ مجھے بھی بندوق تھما دی گئی۔ لیٹ کر ہدف پر پانچ گولیاں داغنی تھی۔ ایک سارجنٹ ہر لڑکے کے پاس کھڑا تھا، بندوق کا بٹ کاندھے سے لگا دیا گیا اور ایک آنکھ سے ہدف کو دیکھتے ہوئے ٹریگر دبانے کو کہا گیا۔ جب پہلی بار میں نے ٹریگر دبایا تو ایک زور کا جھٹکا لگا اور گولی ادھر ادھر ہوگئی لیکن بقیہ چار گولیاں ٹھیک نشانے پر لگ گئیں، مجھے شاباشیاں ملیں۔ بچپن میں کھیلنے کودنے پر ضرور پابندی تھی لیکن پڑھنے لکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ یہ کہا جاتا تھا کہ خوب پڑھو لکھو، یہی وجہ ہے کہ آج تک لاکھوں کتابیں پڑھ چکا ہوں اور پچاسوں کتابیں لکھ چکا ہوں۔ تعلیم میں بھی اچھا طالب علم رہا پہلے قاصد پورہ پرائمری اسکول، پھر گورنمنٹ مڈل اسکول اور پھر رحمانیہ ہائی اسکول کے امتحانات امتیازی نمبرات سے پاس کیے اور مقامی کالج جگدمبا مہاودھیالیہ میں بی۔ اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ یعنی بچپن کا دور بڑا زریں اور تعلم و تربیت والا تھا جو اب یادوں میں صرف جگمگاتا ہے۔

[تعارف جون 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے]

■

Hyder Bayabani
Basera
Achalpur City - 444806 (MS)
Mob.: 8055056961

نذیر بنارسی

ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

کہیں پڑے نہ محبت کی مار ہولی میں
ادا سے پریم کرو دل سے پیار ہولی میں
گلے میں ڈال دو بانہوں کا ہار ہولی میں
اتارو ایک برس کا خمار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

لگا کے آگ بڑھی آگے رات کی جوگن
نئے لباس میں آئی ہے صبح کی مالن
نظر نظر ہے کنواری ادا ادا کمسن
ہیں رنگ رنگ سے سب رنگ بار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

ہوا ہر ایک کو چل پھر کے گدگداتی ہے
نہیں جو ہنستے انھیں چھیڑ کر ہنساتی ہے
حیا گلوں کو تو کلیوں کو شرم آتی ہے
بڑھاؤ بڑھ کے چمن کا وقار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

یہ کس نے رنگ بھرا ہر کلی کی پیالی میں
گلال رکھ دیا کس نے گلوں کی تھالی میں
کہاں کی مستی ہے مالن میں اور مالی میں
یہی ہیں سارے چمن کی پکار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

تمھیں سے پھول چمن کے تمھیں سے پھلواری
سجائے جاؤ دلوں کے گلاب کی کیاری
چلائے جاؤ نشیلی نظر سے پچکاری
لٹائے جاؤ برابر بہار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

ملے ہو بارہ مہینوں کی دیکھ بھال کے بعد
یہ دن ستارے دکھاتے ہیں کتنی چال کے بعد
یہ دن گیا تو پھر آئے گا ایک سال کے بعد
نگاہیں کرتے چلو چار یار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

برائی آج نہ ایسے رہے نہ ویسے رہے
صفائی دل میں رہے آج چاہے جیسے رہے
غبار دل میں کسی کے رہے تو کیسے رہے
ابیر اڑتی ہے بن کر غبار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

حیا میں ڈوبنے والے بھی آج ابھرتے ہیں
حسین شوخیاں کرتے ہوئے گزرتے ہیں
جو چوٹ سے کبھی بچتے تھے چوٹ کرتے ہیں
ہرن بھی کھیل رہے ہیں شکار ہولی میں
ملو گلے سے گلے بار بار ہولی میں

■

ماخذ: کلیات نذیر بنارسی، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

بھاگو یار کورونا آیا!

نظم

فریاد آزر

ڈاکٹر فریاد آزر کا تعلق بنارس سے ہے۔ وہ درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ وہ اردو کے ایک معروف و مقبول شاعر ہیں۔ ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ انھوں نے پہلی نظم، برسات کا موسم اس وقت لکھی تھی جب وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔ پرائمری اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے مقرر ہونے کے بعد بچوں کے لیے باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ انھوں نے اپنے اسکول میں ہر ہفتے بچوں کی محفل آراستہ کر کے نظمیں، کہانیاں، لطیفے وغیرہ سننے کا آغاز کیا۔ وہ طالب علموں کو فی البدیہہ نظمیں لکھواتے۔ یہ نظمیں کثیر تعداد میں جمع ہوگئیں تو انھوں نے 'بچوں کا مشاعرہ' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کر دیا جو بے حد مقبول ہوا۔

امریکہ بھی ہارا اس سے
افریقہ بھی ہارا اس سے
ڈر جاپان میں بھی پھیلایا
بھاگو یار کورونا آیا!

بور ہوئے سب بیٹھ کے گھر میں
درد بڑھایا اس نے سر میں
اسکولوں کی بات ہی چھوڑو
ہر اک دفتر بند کرایا
سب لوگوں کو رونا آیا
بھاگو یار کورونا آیا!
چن من نے بھی ماسک لگایا
بھاگو یار کورونا آیا

جنگل والے ڈرے ہوئے ہیں
لگتا ہے سب مرے ہوئے ہیں
عقل مند خرگوش بہت تھا
اس نے سب کو ماسک لگایا
شیر کا اک فرمان جو آیا

سب نے انجکشن لگوایا
سارے جنگل والے خوش تھے
گورے خوش تھے کالے خوش تھے
سب لوگوں نے ماسک جو پھینکا
پھر اپنی آنکھوں سے دیکھا
آیا پھر سب کو ہی رونا
بھیس بدل کر آیا کورونا

■

Dr.Fariyad Azer
E11/73, Jahan Panah
Hauz Rani , Malviya Nagar
New Delhi-110017
Mob: 9990888234

ظہیر رانی بنوری

طوطا

طوطا ایک پرندہ پیارا
کتنا پیارا کتنا نیارا
ٹیں ٹیں کرتا رہتا طوطا
سن کر سب کو اچھا لگتا
ہرا رنگ جو ہے طوطے کا
لگتا ہے یہ کتنا اچھا
سرخ رنگ کی چونچ ہے اس کی
قینچی جیسی تیز ہے لگتی
جو بھی بولیں فوراً سیکھے
اور دہرائے ٹیں ٹیں کرکے
کوئی اجنبی آئے گر چہ
ٹیں ٹیں کرکے شور مچائے
نجومی اکثر طوطا پالے
لوگوں کی یہ فال بتائے

[تعارف جون 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں]

■

Zaheer Ranebennuri
Mrutyunijaya Nagar
1273, Panebennur- 581115 (Karnataka)
Mob.: 9844410201

ضیاء الرحمن جعفری

شاپنگ مال

چلو نہ ممی، شاپنگ مال
لے آئیں گے اک فٹ بال
وہاں پہ ملتی چیزیں ساری
اچھی اچھی پیاری پیاری
کپڑے رنگ، برنگے ہوتے
کچھ بھی نہیں بے ڈھنگے ہوتے
ملتی چیزیں بھی کھانے کی
نہیں ضرورت سمجھانے کی
سب پر قیمت لکھی ہوئی ہے
جو ہے ضرورت لکھی ہوئی ہے
آفر بھی تو خوب یہاں ہے
اس قیمت میں اور کہاں ہے
نہیں پسند تو چینج بھی کردیں
وو پھر سے ایرنج بھی کردیں
کیش نہیں بھی تو کیا غم ہے
پاس آگر جو اے ٹی ایم ہے
اور بہانے کرو نہ ممی
یہیں مال ہے چلو نہ ممی

[تعارف فروری 2021 کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے]

■

Dr. Zeaur Rahman Jafri
Dept of Hindi
Mirza Ghalib College
Gaya - 823001 (Bihar)

ماں

شبیر اصغر

ذرا اپنا آنچل اڑھاؤ نا ماں
مرے اشک پھر سے چھپاؤ نا ماں
ہوئی صبح کچھ بھی پکاؤ نا ماں
لگی بھوک ہے کچھ کھلاؤ نا ماں
نہ ہو دیر جانے میں اسکول اب
اٹھو بستہ میرا اٹھاؤ نا ماں
کہیں کھو نہ جاؤں میں پھر بھیڑ میں
مجھے اپنی انگلی تھماؤ نا ماں
کھڑا ہوں سرہانے بہت دیر سے
اٹھو مجھ کو جھولا جھلاؤ نا ماں
مجھے نیند آتی نہیں رات بھر
وہ چندا کی لوری سناؤ نا ماں
زمانہ ہے کہتا کہ پتھر ہوں میں
تمہارا ہوں گل یہ بتاؤ نا ماں
کہاں جارہی ہو مجھے چھوڑ کر
مجھے ساتھ میں لے کے جاؤ نا ماں
ہے شبیر پھر منھ کے بل گر پڑا
اسے گود میں تم اٹھاؤ نا ماں

■

Shabbir Asghar
481/1, G.T.Road.Shibpur,
Howrah.711102.(W.B)
Mob.: 8100026557

واہ پکوڑی گرم گرم

فہیم احمد

خوب کرکری پیاری لگتی
کھا لینے کی چاہت جگتی
ساتھ ملے جو چٹنی تو پھر
کرلوں ساری ہضم ہضم
واہ پکوڑی گرم گرم
بیقرار لالچ کے مارے
کھاؤ لے لے کر چٹخارے
مزہ اگر تم لینا چاہو
چھوڑو ساری شرم شرم
واہ پکوڑی گرم گرم
نہیں ضرورت ہے برفی کی
لگے جلیبی بھی اب پھیکی
کاش! پکوڑی روز چٹپٹی
پاؤں میں ہر قدم قدم
واہ پکوڑی گرم گرم
نازش آئی دوڑی دوڑی
بولی کھا کر آٹھ پکوڑی
امی سے تم نہیں بتانا
تم کو میری، قسم قسم
واہ پکوڑی گرم گرم

■

Dr. Faheem Ahmad
Asst. Professor, Dept of Hindi
Mahatma Gandhi Memorial, PG College
Chaudhary Sarai
Sambhal - 244302 (UP)
Mob.: 8896340824

وزیر عالم

میرا گاؤں

مرا گاؤں ہے اک شگفتہ چمن   محبت اخوت کا گنگ و جمن
یہاں رب کی رحمت ہے سایہ فگن   یہ راہ ترقی پہ ہے گامزن
گاؤں میرا بھلے شہر سے دور ہے
اب تو یہ بھی وسائل سے بھرپور ہے

یہاں کی سڑک اب تو پکی بھی ہے   ہمیشہ مہیا سواری بھی ہے
ذرا دور پر گیس ایجنسی بھی ہے   یہاں اینٹیں بنتی ہیں چمنی بھی ہے
گاؤں میرا بھلے شہر سے دور ہے
اب تو یہ بھی وسائل سے بھرپور ہے

گاؤں میں اب ہر اک گھر میں بجلی بھی ہے   لیپ ٹاپ اور ایل سی ڈی، ٹی وی بھی ہے
بلب، پنکھا بھی کولر بھی اے سی بھی ہے   گھر میں سامان دیسی بدیسی بھی ہے
گاؤں میرا بھلے شہر سے دور ہے
اب تو یہ بھی وسائل سے بھرپور ہے

ڈاکٹر ہیں، دوا، ہوسپٹل بھی ہے   بینک، اسکول، بازار، ہوٹل بھی ہے
پانی ٹنکی ہے اور گھر میں نل جل بھی ہے   کھیت سیراب کرنے کو دمکل بھی ہے
گاؤں میرا بھلے شہر سے دور ہے
اب تو یہ بھی وسائل سے بھرپور ہے

کسانوں کے بھی اچھے حالات ہیں   جدید اب زراعت کے آلات ہیں
مشینیں زبردست سوغات ہیں   یہ سائنس کے سب کمالات ہیں
گاؤں میرا بھلے شہر سے دور ہے
اب تو یہ بھی وسائل سے بھرپور ہے

ہن برستا رہے میرے رب گاؤں میں   فیض ہی سے تیرے خوش ہیں سب گاؤں میں
یہ کرشمہ ہے تیرا عجب گاؤں میں   شہر جیسی سہولت ہے اب گاؤں میں
گاؤں میرا بھلے شہر سے دور ہے
اب تو یہ بھی وسائل سے بھرپور ہے

■

Md. Wazeer Alam
Madrasa Rahmatul Uloom
Naukatola, Hardiya, Raxzul
East Champaran (Bihar)
Mob.: 9534443838

[تعارف مئی 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے]

ٹکنالوجی دے گی زبان

حبیب سیفی

نظم

جو ہیں معذور جسمانی طریقے سے نہ گھبرائیں
نئے ٹول آگئے ہیں اب کوئی آپشن بھی اپنائیں

کوئی مفلوج ہاتھوں سے، کوئی گویائی سے قاصر
لگے ہیں زندگی بہتر بنانے میں سبھی ماہر

مٹے گی فونز کو اب ہاتھ میں لینے کی بھی حاجت
کہ ایپل، مائکرو، گوگل نے پالی ہے اب قدرت

اشارہ آنکھ کا کرکے جو چاہو گے وہ کہہ دو گے
مدد سے ٹکنالوجی کی تمنا پوری کر لوگے

معاون کیمرہ گوگل نے اک ایسا لگایا ہے
ہمارا آنے والا کل حسیں بہتر بنایا ہے

کوئی گر قوتِ گویائی سے محروم بھی ہے اب
بھویں اپنی اٹھا کر مسکرا کر بات کرلے سب

موبائل اپلی کیشن میں جو تاثرات ابھریں گے
انھیں کی معرفت اپنے وہ دل کی بات کہہ دیں گے

سہولت ٹنٹوں، گونگوں کو ملے گی ٹیکنالوجی سے
گھما کر چہرہ بولیں گے سبھی اب اپنی مرضی سے

نظامِ زیست کو آساں بنانے کی ہی ٹھانی ہے
سبھی کو فیض پہنچاؤ یہی حکمِ قرآنی ہے

[تعارف مارچ2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں]

■

Habib Saifi
E-12/51B, 1st Floor, Hauz Rani
Malviya Nagar
New Delhi - 110017
Mob.: 7838038973

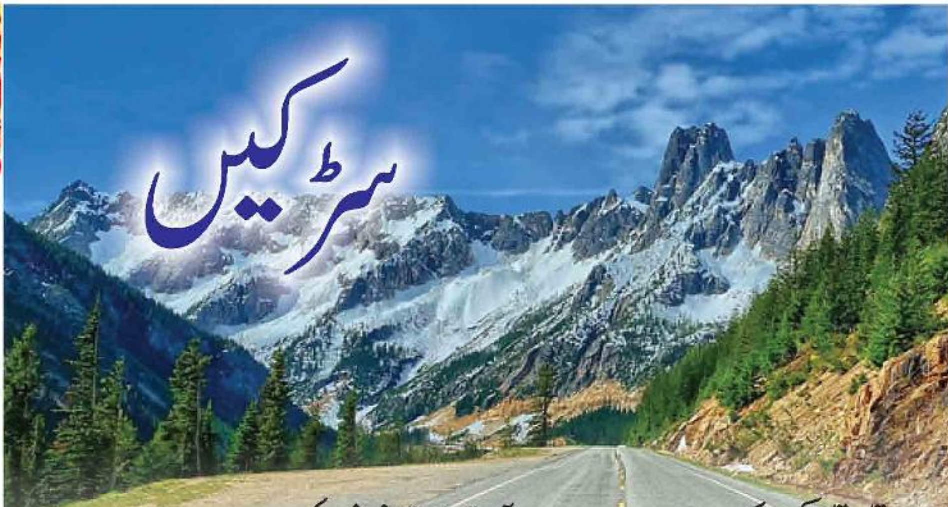

سڑکیں

جاوید رانا

پتلی پتلی کچی سڑکیں
چوڑی چوڑی پکی سڑکیں

سردی گرمی برساتوں میں
اجلے دن کالی راتوں میں
بوجھ زمانے کا سہتی ہیں
کچھ نہیں کہتی چپ رہتی ہیں
پیاری بھولی بھالی سڑکیں
بچھڑے ہوئے لوگوں کو ملائیں
کالج اور اسکول بھی جائیں
منزل پر یہ پہنچاتی ہیں
سب کو رستہ بتلاتی ہیں
سیدھی سیدھی لمبی سڑکیں

چھاؤں کا لہنگا دھوپ کا جمپر
دھول میں لپٹی جائے دن بھر
بچوں کے من کو بھاتی ہیں
اتراتی ہیں لہراتی ہیں
چمکیلی بل کھاتی سڑکیں

آتے جاتے انسانوں کو
جیتے مرتے حیوانوں کو
سر پہ نیل گگن کو اوڑھے
خاموشی سے سب کچھ دیکھے
کالی، میلی، بھوری سڑکیں

گرتے پڑتے سنبھلنا سکھائیں
رک رک کر یہ چلنا سکھائیں
ہم کو رکھے بیدار ہمیشہ
چوکنا ہوشیار ہمیشہ
آڑھی ٹیڑھی ترچھی سڑکیں

■

Javed Rana
143/29, Near Char Mazar
Dr. Zakir Husain Ward, Mominpura
Burhanpur - 450331(M.P)

دِوک رمیش، مترجم: استوتی اگروال

آنکھیں بند کرو نانی

استوتی اگروال اردو کی نوجوان شاعرہ، ادیبہ اورتبصرہ نگار ہیں۔ 12 برس کی عمر میں انھوں نے لکھنا شروع کیا اور چھ مہینے میں ہی انھوں نے اردو پڑھنا لکھنا مکمل طور پر سیکھ لیا۔ ان کی کہانیاں مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان دنوں سہ ماہی ’انتساب عالمی‘ اور ماہنامہ ’عالمی زبان‘ کی نائب مدیرہ کے فرائض بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی اور والدانل اگروال کی تربیت نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی ہے۔

’’**نانی** میں پہاڑ لا سکتی ہوں۔‘‘ کہہ کر ڈولو ہنسی۔

نانی چونکیں۔ بولیں ’’ہے بھگوان! لڑکی ہے کہ طوفان۔ لیکن کیسے؟ کیا تمھاری کوئی پری دوست ہے، جو مدد کرے گی؟‘‘

’’ہاں نانی! ہے نہ میری پری دوست۔‘‘

’’اچھا!‘‘ نانی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

’’پرتم پر یقین کون کرے گا۔ کمپیوٹر کے زمانے میں کیسی باتیں کر رہی ہو؟‘‘

’’نانی جب دیکھو تب اپنی ہی باتیں کرتی ہو۔ مجھے پری اچھی لگتی ہے۔ وہی میری دوست ہے۔‘‘

’’اچھا... کیا تمھاری پری پہاڑ اُٹھا سکتی ہے؟‘‘ نانی نے بات ٹالنے کو پوچھا۔

’’ہاں... ہاں...!‘‘

’’پر پَری تو کومل ہوتی ہے؟‘‘

’’پر اُس میں طاقت بہت ہے۔ وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ ایک بار میں نے پری دوست سے کہا کہ زمین پر کھڑی کھڑی تارا چھوؤ۔ پری نے مجھے گود میں اٹھایا اور لمبی ہوتی چلی گئی اور پہنچ گئے ہم تارے کے پاس۔ میں نے تو خوب چھوا تارے کو۔‘‘

’’اور کیا کیا تھا تارے پر؟‘‘ نانی نے پوچھا۔

ڈولُو کو نانی کی جستجو اچھی لگی۔ اُس نے مسرت سے جواب دیا ''تارے پر لمبے لمبے بچے تھے۔ بانس جیسے! نیچے کھڑے کھڑے ہی پہلی منزل کی چھت سے سامان اُتار سکتے تھے۔ مجھے تو ایسا لگا جیسے قطب مینار کے پاس کھڑی ہوں۔ سچی! اور اِس سے مزے دار بات یہ ہے کہ اُن کے ماں باپ قد میں بونے تھے۔''

''ایں!'' نانی سچ مُچ چونک گئی تھیں۔

''ہاں مجھے بھی حیرت ہوئی تھی نانی۔ پر پَری دوست نے بتایا کہ تارے پر عمر بڑھنے کے ساتھ قد چھوٹا ہوتا ہے، دھرتی پر بڑا۔''

''اور کیا وہ بولتے بھی تھے۔ تُو نے بات کی؟'' نانی نے پوچھا۔

''ہاں ... ہاں نانی، خوب باتیں کیں۔ پر میں آپ کو بتاؤں گی نہیں۔ ارے، میں نے تو پری کو ندی اُٹھا کر آسمان میں اُڑتے بھی دیکھا ہے۔'' ڈولُو نے بتایا۔

''ندی کو اٹھا کر! اور پانی؟''

''ارے نانی، پانی سمیت۔ بالکل لہراتے لمبے سے کپڑے سی لگ رہی تھی۔ دور دور تک۔ کتنا مزہ آیا تھا۔''

نانی کو ڈولُو کی بات پر بہت مزہ آ رہا تھا۔ پر ڈولُو ناراض ہو کر کہیں بات روک نہ دے، اِس کا بھی تو ڈر تھا نہ! سو بولیں۔

''اچھا ڈولُو تُو تو روز پری سے ملتی ہے، پری کبھی تھکتی ہے کہ نہیں؟''

''تھکتی ہے نہ نانی۔ جب کوئی اُس پر بھروسہ نہیں کرتا۔ جب کوئی اسے بور کرتا ہے، تو بہت تھک جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو وہ پسند نہیں کرتی۔ میں تو نہ اُس پر شک کرتی ہوں اور نہ ہی اسے بور کرتی ہوں۔''

''چلو آج سے میں بھی تجھ جیسی ہی ہو گئی۔'' نانی نے کہا۔

''تو سنو نانی۔ ایک بار مسکراتے ہوئے پری نے کہا۔ چلو آج تمھیں پورا جنگل نِگل کر دِکھاتی ہوں۔ سُن کر مجھے کچھ کچھ اندیشہ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پری کا منہ اُترنے لگا۔ اُداسی چھانے لگی۔ میں نے جھٹ سے اپنی غلطی سمجھی۔ پری پر بھروسہ کیا۔ پری کے منہ پر خوشی لوٹ آئی۔ وہ مجھے جنگل کے پاس لے گئی۔ پری نے دیکھتے ہی دیکھتے پورا جنگل نگل لیا۔ میں تو حیرت سے بھری تھی۔ پر خوش بہت تھی۔

میں نے پوچھا ''پری، یہ جنگل اب کیا تمھارے پیٹ میں ہی رہے گا؟''

پری بولی ''نہیں ... نہیں! میں نے تو اِسے بس تمھیں مزہ دینے کے لیے نِگلا تھا۔ جنگل تو ہمارا دوست ہے۔ کیا کیا نہیں دیتا آدمی کو! جنگل ختم ہو جائے تو انسان کا جینا ہی دوبھر ہو جائے۔ پتہ نہیں کیسے راکشس ہیں وہ جو جنگل کو کاٹ کر تباہ کر رہے ہیں۔ لو، یہ رہا تمھارا جنگل۔ کہتے کہتے پری نے جنگل اُگل دیا۔ جنگل پھر اپنی جگہ تھا۔ دُھلا دُھلا شاید پری کے پیٹ میں دُھل گیا تھا۔

نانی ڈولُو کا من رکھنے اور اُس کی باتوں کا مزہ لینے کے لیے بے چین لگ رہی تھیں۔ اُدھر ڈولُو کو پورا مزہ آ رہا تھا۔ خوش ہو کر بولی ''نانی۔ آپ یقین کریں تو ایک اور کارنامہ بتاؤں۔''

''ہاں.. ہاں، ضرور سناؤ۔''

ڈولُو ہنسی۔ اُس کا چہرہ فخر سے چمک اُٹھا۔ تھوڑا پانی پیا اور دادی۔ نانی کی طرح کھنکھارا۔ بولی ''نانی، پری تو اپنی آنکھوں میں پورا سمندر بھی بھر سکتی ہے۔ مچھلیوں اور سمندری مخلوقات سمیت۔ بالکل 'ایکویریم' لگتی ہیں تب پری کی آنکھیں۔ ایک بار تو سارے بادل ہی پکڑ کر اپنے بالوں میں بھر لیے تھے۔ بال تب کتنے خوبصورت لگے تھے۔ کالے.. سفید۔ پھولے پھولے سے۔ میں نے ہاتھ لگا کر

دیکھا، تو گیلے بھی تھے۔ پر تھوڑی ہی دیر میں پری نے اُنھیں چھوڑ بھی دیا۔ اگر انھیں پکڑے رکھتی تو بارش کیسے ہوتی؟ اور بارش نہ ہوتی، تو پوری دھرتی کو کتنا دُکھ پہنچتا۔ پری کہتی ہے کہ ہمیں ہمیشہ پوری دھرتی کا بھلا کرنا چاہیے۔ کوئی بھی نقصان پہنچانے والی بات نہیں کرنی چاہیے۔ نانی، میں بھی کسی کو کبھی نقصان نہیں پہنچاؤں گی، پرامز....''

''نانی کہیں آپ جھوٹ تو نہیں سمجھ رہیں نا؟''

نانی ذرا سنبھلیں۔ آنکھیں مسلیں۔ سر کو بھی سہلایا۔ بولیں ''نہیں .. نہیں ڈولُو! سچ جب ایسے ایسے کارنامے اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی، تو کتنا مزہ آئے گا۔ سچ، میں تو شک و شبہ کی بات دل میں لاؤں گی تک نہیں۔''

''ہاں — ہاں، میں اُس سے آپ کو مِلا دوں گی!'' ڈولُو کی آواز میں غضب کا اعتماد تھا۔

''پر پہلے یہ تو بتاؤ کہ میں پہاڑ لاکر دِکھاؤں؟''

''اچھا، دِکھا۔ پر چوٹ نہیں کھا جانا۔'' نانی نے بچوں کی طرح کہا۔

''تو پھر آنکھیں بند کرو۔ میں ابھی آئی پہاڑ لے کر۔''

نانی نے آنکھیں بند کرلیں۔ بچی جو بن گئیں تھیں۔ ڈولُو تھوڑی ہی دیر میں پہاڑ لے کر آ گئی۔ بولی۔ ''نانی آنکھیں کھولو اور دیکھو یہ پہاڑ!''

نانی نے آنکھیں کھول دیں۔ پوچھا ''کہاں؟''

''یہاں۔ یہ کیا ہے؟''

''پہاڑ!''

اب کیا تھا، دونوں خوب ہنسی، خوب ہنسی۔ نانی نے ڈولُو کو کھینچ کر اُس کا ماتھا چوم لیا۔ پیار سے بولیں ''تم سچ مُچ بہت نٹ کھٹ ہو ڈولُو!''

اصل میں ڈولُو نے ایک کاغذ پر پہاڑ کی تصویر بنا رکھی تھی۔ اُسی کو دِکھا کر جب اُس نے نانی سے پوچھا ''یہ کیا ہے'' تو نانی کے منہ سے سہج ہی نکلا ''پہاڑ!''

نانی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ بھئی ڈولُو اپنی پری دوست سے کب ملواؤ گی؟''

''کہو تو ابھی۔''

''ٹھیک ہے۔ ملاؤ!''

''تو کرو آنکھیں بند۔''

نانی نے آنکھیں بند کرلیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ڈولُو نے کہا۔ ''نانی آنکھیں کھولو۔'' نانی نے آنکھیں کھول دیں۔ پوچھا ''کہاں ہے پری؟''

''تو یہ کیا ہے؟''

''پری۔'' نانی نے کہا۔

دونوں پھر خوب ہنسیں۔ اصل میں اِس بار ڈولُو نے اپنی ہی فراک پر کاغذ لگا رکھا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ ''پری۔''

نانی نے ہنستے ہنستے پوچھا ''اور وہ سب کارنامے؟''

آپ شک تو نہیں کریں گی نہ نانی؟'' ڈولُو نے تھوڑا سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ارے، نہیں۔''

''جب پری میں ہوں تو کارنامے بھی میرے ہی ہوئے نہ!''

نانی کی آنکھیں خوشی سے بھر آئیں۔ سوچا ''کتنی Imaginative ہے میری بچی۔ ایشور اِسے اسی طرح Creative بنائے رکھے۔''

■

Stuti Agrawal
Agrawal Jewellers
Sironj- 464228 (MP)
Mob.: 9340710963
Email:Stuti9575@gmail.com

کہانی

مسٹر لائبریرین

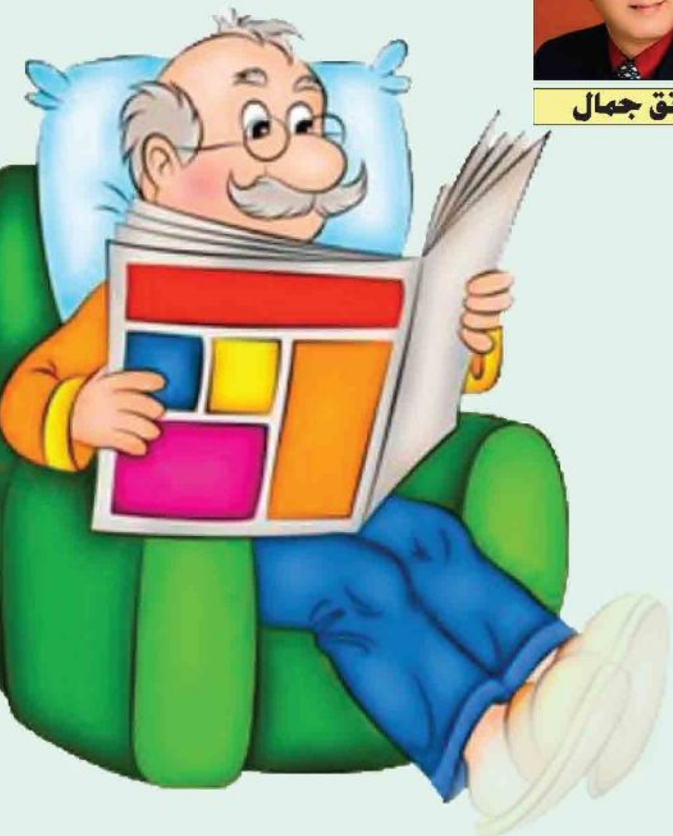

رونق جمال

میں نامہ نگار ہوں، اس لیے میری نظر میں شہر کے سیاست داں، افسران سماجی خدمت گار، صنعت کار اور شہر کی جانی مانی ہستیاں ہمیشہ رہتی ہیں۔ جب سے نئے ایس پی اشفاق احمد خان شہر میں آئے ہیں اور ضلعے کی ذمے داری سنبھالی ہے ہر روز اخبارات میں ان کے اور ان کے کام کے چرچے ہوتے رہتے ہیں۔ میں اس بات پر حیران بھی تھا اور پریشان بھی کہ انھیں اخبارات مسٹر لائبریرین لکھ کر کیوں مخاطب کرتے ہیں یا ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے کئی بار ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی مصروفیت کی وجہ سے میں ہر بار ان سے ملاقات کا وقت لینے میں ناکام رہا۔ میں چاہتا تھا کہ ان سے ملاقات ہوتو میں ان کا انٹرویو بھی کرلوں گا اور انھیں مسٹر لائبریرین کہنے کے راز سے پردہ بھی اٹھا دوں گا تاکہ ضلعے کے باشندگان کے دل و دماغ میں اٹھ رہے تمام سوالوں کے جوابات بھی مل جائیں۔

آج میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہیں رہی جب میرے موبائل کی گھنٹی بجی اور اس اسکرین پر ایس پی اشفاق احمد خان کا نام نمودار ہوا۔ میں نے فوراً بٹن دبا کر ہیلو کہا تو انھوں نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

''کیا میں اخبار 'عوام کی رائے' کے نامہ نگار فیروز عالم سے بات کرسکتا ہوں!''

''جی جناب—! میں فیروز عالم ہی بول رہا ہوں... بتائیے کیسے یاد کیا!''

''ارے بھائی آپ بار بار مجھ سے فرصت سے ملاقات کے لیے وقت چاہ رہے تھے لیکن میں ضلعے کے بگڑے ہوئے حالات کو درست کرنے میں اتنا مشغول تھا کہ چاہ کر بھی آپ کو ملاقات کا وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ کئی ہفتوں بعد آج فرصت کے لمحات میسر ہوئے تو میں نے سوچا کیوں نہ آپ کو وقت دے دیا جائے۔!''

''آپ حکم کیجیے میں حاضر ہوجاؤں گا!''

''فیروز صاحب میں بنگلے پر ہی ہوں... آپ ایسا کیجیے

ایک بجے بنگلے آجایئے... گفتگو بھی ہوگی اور کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں گے!''

''جناب... جناب اس تکلف کی کیا ضرورت ہے!''

''تکلف نہیں عالم صاحب... آپ کو انتظار کی جو زحمت اٹھانا پڑی ہے اس کا ازالہ کر رہا ہوں''

''شکریہ جناب...! میں وقت پر حاضر ہوجاؤں گا!''

میں بنگلے پہنچا تو ایس پی صاحب میرے منتظر تھے۔ میرا پرتپاک استقبال کیا اور سیدھا کھانے کی میز پر لے کر گئے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو اطمینان سے بنگلے کے عالی شان لان میں آکر بیٹھ گئے اور پھر انھوں نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔

''بتایئے فیروز صاحب میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔''

''خدمت نہیں جناب... میں 'اخبار کی رائے' کے نامہ نگار کی حیثیت سے آپ کا انٹرویو قلم بند کرنا چاہتا ہوں... تاکہ ضلع کے عوام... مسٹر لائبریرین... کے سلسلے میں تفصیل سے جان سکیں! میرا مطلب ہے آپ کے نام اور عہدے کے ساتھ یہ لفظ 'مسٹر لائبریرین' کیسے اور کیوں جڑ گیا!''

میرے اس سوال پر ایس پی اشفاق احمد خان نے آنکھیں موند لی اور کچھ یاد کرنے لگے۔ آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا اور مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''فیروز عالم صاحب! میں بہت غریب ماں باپ کی اولاد ہوں۔ اسکول کے زمانے میں میری پڑھائی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی سرکاری اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ میں ایک اچھا طالب علم ہوں۔ لیکن غریبی لاچاری کے باعث میرے پاس کتابیں بھی نہیں ہوتی تھیں۔ اسکول میں رشید جناب تھے۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ اکثر اپنے بچوں کے کپڑے جوتے چپل مجھے لاکر دیتے تھے جس کی وجہ سے میں ڈھنگ سے جسم ڈھانپ سکتا تھا۔ انھیں میری غربت کا اچھی طرح احساس تھا۔ اس لیے وہ اکثر میری مدد کردیا کرتے تھے۔ جیسے نوٹ بک خرید کر لادینا۔ اسکول کی فیس ادا کردینا وغیرہ۔

اب میں بڑی جماعت میں پہنچ چکا تھا۔ کتابیں کافی مہنگی تھیں جو میری دسترس سے باہر تھیں اور ضروری بھی تھیں۔ ایک روز رشید جناب مجھے شہر کی معروف لائبریری میں لے کر گئے اور مجھے لائبریری کا ممبر بنادیا۔ معمولی فیس ادا کرنے کے بعد مجھے کورس کی مہنگی مہنگی کتابیں لائبریری سے مل جاتی تھیں۔ اس طرح لائبریری کی کتابوں سے فیض اٹھا کر میں نے بی اے، ایم اے اور آئی پی ایس کرلیا اور پولس کی نوکری میں آگیا۔ نوکری ملنے کے بعد میں جہاں بھی تعینات ہوتا ہوں... وہاں کے لوگوں کے تعاون سے عالی شان لائبریری کی تشکیل کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں تاکہ مجھ جیسے غریب طلبا لائبریری سے فیض اٹھا کر میری طرح زندگی میں کامیاب انسان بن سکیں۔ بس اس وجہ سے میں جہاں بھی جاتا ہوں 'مسٹر لائبریرین' کے نام سے جانا جاتا ہوں!''

''ایس پی صاحب...! اس اہم معلومات کے لیے شکریہ! ان شاء اللہ میں آپ کی کہانی کو کل کے اخبار میں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کروں گا!''

[فروری 2021 کے شمارے میں تعارف ملاحظہ فرمائیں]

■

Ronaq Jamal
'Kainat', Street No 9, New Adarsh Nagar
Durg - 491001 (Chattisgarh)
Mob.: 8839034844

انار

اقبال برکی

گھر میں سب اکٹھا تھے۔ دادا ابو صوفے پر اخبار پڑھ رہے تھے۔ تایا ابو اسی صوفے کے دوسرے کونے پر بیٹھے تھے اور دیوار گھڑی کا سیل تبدیل کر رہے تھے۔ بچے ڈرائنگ روم کے فرش پر بیٹھے تھے اور سب ایک ساتھ دائرہ بنا کر کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔ چاچا ابو چھوٹی عطیہ کے نزدیک بیٹھے تھے جو فرش پر پڑی پڑی کروٹ ہوتی اور پھر پلٹ کر آگے کھسکنے لگتی اور جو بھی چیز ہاتھ آتی پکڑ کر منہ میں ڈالنے لگتی۔ بڑی امی اور چاچی امی دونوں ایک ساتھ ڈرائنگ روم میں آئیں۔ بڑی امی کے ہاتھ میں ایک ٹوکرا تھا اور چاچی امی ایک ہاتھ میں ایک بڑی پلیٹ اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھری لیے ہوئے تھیں۔ ساری چیزیں انھوں نے دادی امی کے سامنے رکھ دیں۔ دادی امی اسی صوفے کے اس کونے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں جس کونے پر تایا ابو بیٹھے تھے۔

ٹوکرے پر نظر پڑتے ہی دادا ابو نے اخبار رکھ دیا اور حیرانی سے بولے، ’’ارے تم یہ انار کاٹنے جا رہی ہو مگر میرا شیر، انار کا دشمن تو ہے ہی نہیں۔ کہاں ہے وہ؟‘‘

’’سب ہیں۔ وہی اکیلا نہیں ہے۔ معلوم نہیں کھانا بھی کھایا کہ نہیں۔‘‘ دادی امی بولیں۔

’’کھانا تو ان کے ساتھ ہی کھایا تھا لیکن کب نکلا کوئی دیکھ ہی نہیں سکا۔‘‘ بڑی امی بولیں۔

’’سعود، بیٹا، نعیم الظفر کہاں ہے؟‘‘ چاچی امی نے بچوں کو مخاطب کیا۔

’’امی میں یہاں ہوں۔ دیکھو، دادا ابو دیکھو! جلدی دیکھو! میرے ہاتھ میں کیا ہے؟‘‘

چاچی امی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی نعیم الظفر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور سیدھا دادا ابو کی طرف دندناتا چلا گیا۔ اس کی آواز سن کر دوسرے بچے بھی اس کو دیکھنے لگے۔ مریم جو لگ بھگ اس کی ہم عمر اور تایا زاد بہن تھی، دائرہ چھوڑ کر اٹھی اور اس کے پیچھے لپکی اور دادا ابو کے قریب اس کے بالکل قریب کھڑی ہو کر وہ دیکھنے لگی جو وہ دادا ابو کو بتا رہا تھا۔

دادا ابو نے دیکھا اس نے اپنی چٹکی میں ایک کالی تتلی دبا رکھی ہے۔ یہ ایک عام سی تتلی تھی جو کھیتوں اور جھاڑیوں میں اڑتی نظر آتی ہے۔ تتلی کا رنگ گہرا کالا تھا لیکن پروں کے نچلے حصے میں سفید اور سرخ پٹے پڑے ہوئے تھے۔ پروں پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گہرے سرخ دائرے بھی تھے۔ تتلی دیکھتے ہی دادا ابو بولے، ’’لو جی، دیکھو، آپ کے انار کے ایک نہیں دو دو دشمن اکٹھا ہو گئے!‘‘

انار کا نام سنتے ہی نعیم الظفر نے تتلی مریم کی طرف بڑھا

دی لیکن مریم ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس دوران مریم کا بڑا بھائی متین بھی وہاں آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی تتلی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مریم کے پیچھے ہٹتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر تتلی کو چٹکی میں دبا لیا۔ اس نے دادا ابو سے پوچھا، ''دادا ابو! تتلی انار کی دشمن کیسے ہے؟''

دادا ابو بولے، ''جیسے تم سب کو انار پسند ہے لیکن نعیم الظفر کو سب سے زیادہ پسند ہے اسی طرح تتلی کو بھی پھول تو پسند ہیں لیکن وہ بھی انار کی دیوانی ہوتی ہے۔''

اب دوسرے بچے بھی بیٹھے بیٹھے دادا ابو کی طرف گھوم گئے اور ایک ٹک ان کو دیکھنے لگے۔ دادا ابو کے چپ ہوتے ہی چاچی امی بولیں، ''ابا جی، یہ نازک سی تتلی بھلا انار کیسے کھائے گی؟''

یہی سوال سب کے دل میں تھا۔ ہر کوئی اپنی جگہ سوچ رہا تھا کہ یہ ایسی نازک اور کمزور سی تتلی بھلا انار کیسے کھائے گی۔

چاچی امی کے چپ ہوتے ہی مسعود بول پڑا، ''دادا ابو، انار کا سخت چھلکا وہ کیسے اتارے گی؟''

مسعود کے چپ ہوتے ہی دادی امی بول پڑیں، ''آپ بھی نا چپ نہیں رہتے۔ کچھ بھی بول دیتے ہیں!'' وہ ایک انار کو کاٹ کر چار حصوں میں تقسیم کر چکی تھیں۔

''دادا ابو نہیں کھا سکتی!'' نعیم الظفر دادی امی کے کاٹے ہوئے انار سے کچھ دانے نکال کر منہ میں بھرتا ہوا بولا۔

''اچھا اچھا۔ بچو چلو ادھر آؤ!'' انھوں نے متین کے ہاتھ سے تتلی لے لی اور اپنی بائیں چٹکی میں داب لی۔ کچھ دیر سب بچوں کو دیکھتے رہے، پھر بولے، ''جیسے تم کو پسند ہے ایسے ہی اس ننھی سی جان کو بھی انار بہت پسند ہے۔'' ایک لمحہ ٹھہر کر وہ دوبارہ بولے، ''اس کو نا تو ہمارے جیسے مضبوط دانت ہیں نا ہی ہاتھوں کے سخت ناخن جن سے وہ چھلکے اتارے لیکن پھر بھی وہ انار کھاتی ہے۔''

''مگر کیسے؟'' دادا ابو کے چپ ہوتے ہی مریم بے صبری سے بولی۔

''ادھر دیکھو! یہ اس کی نازک سی سونڈ ہے۔ یہ اس کا دانت بھی ہے اور ناخن بھی۔'' دادا ابو بولے۔ سب بچے جھک جھک کر ان کی چٹکی میں دبی تتلی کو دیکھنے لگے تھے۔ اس دوران چاچی امی بھی ان کے قریب آ گئی تھیں۔ وہ بھی غور سے تتلی کو دیکھ رہی تھیں۔

دادا ابو نے کچھ دیر بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔ وہ بولے، ''یہ سونڈ اسے قدرت کا ایک حسین تحفہ ہے۔ جب انار بڑا ہو جاتا ہے اور اندر دانے پکنے لگتے ہیں تو تتلی ان پر بیٹھتی ہے۔ سونڈ کو چھلکوں پر رکھتی ہے اور ایک قسم کا لعاب خارج کرتی ہے۔ اس سے انار کے سخت چھلکے فوراً نرم بلکہ گل جاتے ہیں۔ تتلی آہستہ آہستہ سونڈ اندر داخل کرتی ہے۔ انار دانوں تک سونڈ پہنچ جاتی ہے تو وہ ان کا رس چوستی ہے اور پیتی ہے۔ اس طرح جہاں اور جتنے دانوں تک سونڈ پہنچتا ہے وہ ان کا رس چوس لیتی ہے۔''

''اسی لیے اکثر انار کے چھلکوں پر سوراخ ہوتا ہے اور جس انار پر سوراخ ہوتا ہے وہ ہم نہیں لیتے کیوں کہ وہ خراب ہونے لگتا ہے۔'' چاچا ابو پہلی بار بولے۔

''ان چند دانوں کے علاوہ پورا انار خراب نہیں ہوتا۔ بس ہم ایسا سمجھتے ہیں، اور یہی ہماری نا سمجھی نے اس ننھی سی جان بلکہ اس کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا ہے!'' دادا ابو بولے۔

''وہ کیسے دادا ابو؟'' مسعود نے پوچھا۔

دادا ابو نے ایک بار دادی امی کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتے رہے اور اس کے بعد بولنے لگے، ''انار کے باغوں میں کیڑے مار دواؤں نے ان کی نسل ختم کر دی ہے۔ وہاں جو

رکھوالے ہوتے ہیں وہ بھی چھوٹے چھوٹے بچوں کو لگا دیتے ہیں۔ بچے تتلیاں پکڑ پکڑ کر انھیں دیتے ہیں اور رکھوالے ان کا پر نوچ کر ایک ڈِبے میں ان بے چاری ننھی جانوں کو پھینک کر تلف کر دیتے ہیں۔ رکھوالے ان بچوں کو ایک تتلی کے بدلے دو روپیہ دیتے ہیں کیوں کہ اگر بغیر داغ یا سوراخ کا انار بڑا ہو جاتا ہے تو وہ انھیں اونچے داموں میں باہر ملکوں میں برآمد کرتے ہیں اور خوب روپیہ کماتے ہیں۔ مگر ان کی کمائی سے قدرت کا یہ حسین تحفہ دیکھتے دیکھتے ختم ہوتا جا رہا ہے۔'' دادا جی ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔

''مگر ایسا خراب انار کوئی لیتا بھی نہیں ہے۔ باغ والوں کا کتنا نقصان ہوتا ہے۔'' چاچا ابو بولے۔

''ہاں بیٹا! آج کا انسان نفاست پسند تو ہے مگر بے رحم اور بے مروّت بھی ہے۔ وہ دوسروں کے حقوق سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔ اگر آج کا انسان اپنے مفاد کے آگے دوسروں کے حقوق کا بھی لحاظ کرنے لگے تو کوئی جھگڑا ہی نہ رہے اور نہ کسی کو کوئی خطرہ ہو۔ سب آرام سے کھائیں پئیں اور چین سے رہیں۔''

ان کے چپ ہوتے ہی دادی امی بولیں، ''میں کہتی ہوں آپ سب کی فکر چھوڑیں اور یہ انار کھائیں!'' وہ ان کی طرف انار دانوں کی پلیٹ بڑھا چکی تھیں۔ ان کے چپ ہوتے ہی سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور انار دانوں جیسے دانتوں سے انار دانوں کو کچل کر انار دانوں کا رس پینے لگے۔ نعیم الظفر کا منہ سب سے تیز چل رہا تھا۔

[تعارف اپریل 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں]

■

Dr. Iqbal Berki
155, MHADA, Noor Bagh
Malegaon- 423 203
Dist. Nasik (Maharashtra)
Mob. 8329273266

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر........................ بتاریخ........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زیر تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

Email.: magazines@ncpul.in , 011-26108159 :فیکس 011-26109746 :فون

دستخط

اندھیرے گھر کا چراغ

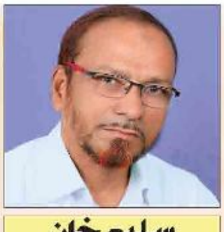

سلیم خان

دس سالہ روی نے چراغ جلایا تو اسے بیمار ماں کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔ اس نے ماں کے پاس چار پائی پر بیٹھ کر پوچھا، ''کیا بات ہے ماں؟''

''چندر کہاں ہے بیٹا۔؟''

''وہ آنگن میں کھیل رہا ہے، تم اس کی چنتا مت کرو۔ لیلا موسی نے تھوڑی کھچڑی دی تھی، اس نے کھا لیا ہے۔''

''اور تم نے کیا کھایا میرے لال۔!؟''

''مجھے بھوک نہیں ہے ماں۔'' روی نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجا کر جواب دیا۔

بیٹے کی اس بات پر ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے اس کے معصوم چہرے کو ہاتھوں میں لے کر رندھی آواز میں کہا، ''بیٹا میں نے تمھارے نام روی اور چندر رکھے ہیں لیکن تمھارے جیون میں تو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔!'' اندھیرے سے روی کو ڈر لگتا تھا مگر ماں کون سے اندھیرے کی بات کر رہی تھی وہ سمجھا نہیں پر ماں کی دکھ بھری باتیں سن کر وہ اداس ہو گیا تھا اور اس کا معصوم ذہن سوچ کے صحرا میں کوئی نخلستان ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، ''ماں لیلا موسی کہہ رہی تھی کل عید کا تہوار ہے۔ یاد ہے ماں پچھلے سال ہمیں تین سو روپے خیرات ملی تھی۔''

''ہاں بیٹا، لیکن اب میں تو بیمار ہوں۔''

''میں جاؤں گا نہ ماں اور چندر کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔''

''نہیں نہیں بیٹا، وہاں موٹر گاڑیوں کی بھاگم بھاگ اور بہت بھیڑ ہوتی ہے۔ اسے مت لے جانا۔''

''ٹھیک ہے ماں، میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ تم میری فکر مت کرنا۔ میں بہت پیسے جما کر کے لاؤں گا۔ اور لوٹتے ہوئے چندر کے لیے کچوری، جلیبی، تمھارے لیے بسکٹ، ناریل پانی اور بخار کی دوا بھی لاؤں گا۔''

''اور اپنے لیے کیا لاؤ گے؟'' ماں کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی۔

''میں اپنے لیے چپل لے آؤں گا، بہت پیر جلتے ہیں میرے۔''

''میرا شہانا (سیانا) بیٹا۔'' ماں نے اسے قریب کر کے اس کی پیشانی چوم لی۔

اگلے دن روی صبح سویرے جاگ گیا۔ تیزی سے ہاتھ منہ دھویا اور ماں سے اجازت لے کر عیدگاہ میدان کی طرف نکل پڑا۔

چلتے چلتے وہ من ہی من میں سوچ رہا تھا: یہ تہوار بھی بھگوان کی دین ہیں۔ اس بہانے غریبوں کو دان دکشنا اور اچھا بھوجن مل جاتا ہے۔ اگر عید اور دیوالی سال میں دو چار بار ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ ان ہی خیالوں میں وہ عیدگاہ میدان کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس نے سوچا شاید میں جلد آ گیا۔ مگر جب دور دور تک اسے کوئی نظر نہیں آیا تو وہ حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، اسے سامنے کچھ فاصلے پر جھونپڑی کے باہر لنگی، نہرو شرٹ اور ٹوپی پہنا ہوا ایک ادھیڑ عمر داڑھی والا شخص نظر آیا۔ روی تیز قدموں سے اس شخص کے پاس پہنچا، نمستے کیا اور ادب سے پوچھا، ''بابا، آج عید ہے نا۔؟''

''ہاں بیٹا۔'' اس شخص نے روی کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''تو پھر لوگ ابھی تک کیوں نہیں آئے!؟''

''بیٹا، یہ عیدلاک ڈاؤن ہے۔''

''عیدلاک ڈاؤن ہے۔!!'' وہ حیرت سے ایک ٹک دیکھتا رہا۔

''ارے بیٹا ، یہ عید لوگ اپنے اپنے گھر پر ہی منائیں گے، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

یہ سن کر روی کو دھکا سا لگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ایک بار پھر اداس نظروں سے عید گاہ میدان کی طرف دیکھا۔ دور دور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گیا۔'' ماں کی دوائی، بھائی کے لیے ناشتہ اب کیسے لے جاؤں گا۔'' ان ہی خیالوں میں وہ پکّی سڑک سے بازار کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک کچھ گرنے کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ اس کے بالکل سامنے سڑک کے موڑ پر ایک میڈم کا اسکوٹر سِلپ (Slip) ہو گیا تھا۔ میڈم اور اس کا بچہ گر گئے تھے۔ روی فوراً دوڑا اور اس نے روتے بلکتے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ وہیں قریب سے گزرتے ہوئے میاں بیوی نے اسکوٹر ایک طرف کیا اور میڈم کو سہارا دے کر اٹھایا ۔میڈم بہت گھبرا گئی تھی، وہ لپک کر روی کے پاس پہنچی اور اپنے بچے کو لے کر بڑی بے تابی سے ٹٹولنے لگی۔'' آنٹی، گھبرایئے مت، بابا بالکل ٹھیک ہے۔'' پھر روی نے سبزی، پھل وغیرہ باسکٹ میں بھر دیے اور میڈم کے سپرد کرتے ہوئے کہا،'' یہ لیجیے آنٹی، آپ کا پرس بھی گر گیا تھا۔'' میڈم اسے حیرت سے دیکھتی ہی رہ گئی، پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا،'' شاباش، تم بہت اچھے بچے ہو۔'' آؤ بیٹے، آؤ میرے ساتھ ۔ یہ سامنے ہمارا ہی بنگلہ ہے۔'' اور روی اسکوٹر کے پیچھے چلتے ہوئے بنگلے پر پہنچا۔

میڈم نے اسے صوفے پر بٹھایا، پانی پلایا اور پوچھا،'' بیٹا کیا نام ہے تمھارا، کہاں رہتے ہو تم۔!؟''

''میرا نام روی ہے، ہم جھونپڑپٹی میں رہتے ہیں۔''

روی کا مرجھایا چہرہ اور لباس دیکھ کر میڈم سمجھ گئی کہ لڑکا کسی اندھیرے گھر کا چراغ ہے۔ اس نے نوکرانی کو اشارہ کر کے کھانا منگوایا۔ مگر روی نے کھانے سے انکار کیا۔

''بیٹے، کھانے کا وقت ہو گیا ہے آج ہمارے یہاں کھا لو!''

''نہیں آنٹی، میری ماں اور چھوٹا بھائی بھوکے ہیں، میں نہیں کھا سکتا۔ چلتا ہوں۔''

روی کی بات سن کر میڈم کا دل بھر آیا۔ اس نے روی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا،'' ٹھیک ہے بیٹا، تھوڑا رک جاؤ۔''

میڈم نے روی کو پلاسٹک کے ایک ڈبّے میں بہت سا کھانا پیک کر دیا۔ اور جاتے وقت اسے پانچ سو روپئے دیتے ہوئے کہا،'' یہ تمھارا انعام ہے۔''

پانچ سو کا نوٹ دیکھ کر روی کی آنکھیں چمک اٹھیں اور چہرہ کِھل گیا۔'' آنٹی، میری تو عید ہو گئی۔ اب میں بھائی کے لیے جلیبی اور ماں کے لیے دوائی بھی لے جاؤں گا۔'' اور وہ تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

روی کو خوش دیکھ کر میڈم کو بڑی خوشی حاصل ہوئی ۔ اس نے من ہی من میں سوچا،'' بھگوان جو کرتا ہے ، اچھا ہی کرتا ہے۔''

کسی شاعر نے بہت خوب کہا ہے۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

[تعارف مارچ 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں]

■

Saleem Khan
Millat Nagar, Faizpur
Distt.: Jalgaon - 425503 (Maharashtra)
Mob.: 9730573897

نا، بابا، نا!

رحیم رضا

رحیم رضا کا تعلق بیاول ضلع جلگاوں مہاراشٹر سے ہے۔ انھوں نے بی ایس سی، ایم اے، بی ایڈ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول و جونیئر کالج بیاول میں پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دی ہیں۔ بچوں کے معروف ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ادارہ بال بھارتی میں نصابی کتب کی تیاری میں ان کی خدمات لی جاتی رہی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی کتابوں میں معصوم محبت، سواری بادل کی (کہانیاں)، پھول پھول خوشبو، جھلمل کرتے تارے (نظمیں) قابل ذکر ہیں۔ انھیں ادب اطفال کے کئی اہم ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ان دنوں دوماہی رسالہ ’ترجمانِ اطفال‘ کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

مئی کی چھٹیاں تھیں! اور دوپہر کا وقت تھا، صحن میں بچوں کا راج تھا۔ سجاد اور ثاقب کیرم کھیل رہے تھے، باقی بچے گپ بازی کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد سجاد نے ثاقب سے کہا ”ثاقب! کوئی دوسرا کھیل کھیلتے ہیں۔“

چلو! میں بازی ہارا تم جیتے۔ بس، ثاقب مسکرا دیا باقی بچوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

سجاد نے سب کو خاموش کیا اور کہا۔ چلو ہم سب مل کر اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں۔

ہوں! باتیں تو یوں بھی ہو رہی تھیں، کھیل کیوں بند کر دیا۔ تمھارا دل نہیں چاہ رہا تھا ہم تو کھیلنے کے لیے تیار تھے کیوں صائمہ؟ صائمہ آٹھویں میں پڑھتی تھی اور بہت تیز تھی۔

ہاں سجاد بھائی آپ نے تو کیرم بورڈ ہی اٹھا کر رکھ دیا۔

ارے سنو تو سہی میں کیا کہہ رہا ہوں، اکثر اپنے گھر آنے والے مہمان یا پھر ٹیچر حضرات ہم سے پوچھتے بتاؤ بڑے ہو کر کیا بنو گے۔ کوئی کہتا ہے ڈاکٹر، کوئی کہتا ہے انجینئر تو کوئی ٹیچر۔ اس میں کون سی نئی بات ہوئی۔ پوچھا تو ہم بھی بتا دیں گے۔

کیا بتائیں گے؟

یہی نا! جو آپ نے ابھی بتایا۔ نہیں اس کے علاوہ بھی کئی جاب ہیں، پھر یہ کیوں بھولتے ہو مقابلہ جاتی امتحانات کی طرف بھی ہمیں توجہ دینی چاہیے۔ اخبارات میں ووکیشنل گائیڈنس کا کالم ہمیشہ رہتا ہے وہ بھی دیکھنا چاہیے۔ ایم پی ایس سی، یو پی ایس سی، آئی اے ایس۔ وغیرہ۔

سجاد بھائی یہ ہماری سمجھ سے باہر کی باتیں ہیں۔

وہی تو سمجھا رہا ہوں۔ ایم پی ایس سی مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن، یو پی ایس سی یونین پبلک سروس کمیشن یعنی انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس۔ پہلے تمھارا گریجویشن تو ہو جائے۔ پھر ایسے امتحانات کی تیاری کرنا اس کے لیے باقاعدہ کلاسیس چلتی ہیں۔ ابھی تم لوگ پرائمری اور سیکنڈری میں پڑھ رہے ہو یہ میں بھی جانتا ہوں لیکن ابھی سے ہمیں اپنا نصب العین طے کرنا ہے جیسے میں نے طے کیا کہ مجھے بی فارما کرنا ہے۔ خیر!

اچھا تنویر تم کیا بننا چاہتے ہو؟

میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں، غریبوں کا ڈاکٹر۔

غریبوں کا ڈاکٹر بھئی یہ کیا الگ سے کوئی ڈگری ہے۔ ایسے نہیں ہوتا ہے ڈاکٹر سب کا ہوتا ہے کیا امیر کیا غریب یہ کہنے کی باتیں ہیں۔ پچھلے مہینے پڑوس والی صابرہ خالہ کی لڑکی شنو کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ دو تین روز تک دوا انجکشن لگائے گئے پھر جب

ڈاکٹر کی فیس نہیں ملی تو بار بار بلانے پر بھی ڈاکٹر صاحب نہیں آئے۔ دونوں ماں بیٹی کا رورو کر برا حال ہوگیا۔ امی نے انھیں پیسے دیے تب دوا انجکشن منگوائے گئے۔ بیچاری دوسروں کے گھروں میں برتن مانجھتی ہے پوچھا لگاتی ہے ایک ہفتے کی کمائی دودن کی دوا میں لگ گئی۔

اچھا تم ثاقب؟

میں ٹیچر بنوں گا۔ بچوں کی ذہن سازی کروں گا، محنت ایمانداری، سچائی، حسن اخلاق جیسی اقدار کو پروان چڑھانے کی کوشش کروں گا، اپنے سماج اور ملک وملت کے نوجوانوں کی اصلاح کا یہ سب سے بہتر راستہ ہے۔ قومی تعلیمی دن کے پروگرام میں ضیاء النبی سر نے تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

اچھا تحسین تم...

میں بھی ٹیچر بنوں گی۔ لڑکیوں میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا جذبہ پیدا ہو، اس لیے زیادہ محنت لڑکیوں پر کروں گی جیسا کہ ہمارے اساتذہ کہتے ہیں اور اس کی مثال بھی ہماری امی کی شکل میں ہمیں دیکھنے کو ملی کہ اگر کوئی شخص تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس کی اپنی ترقی ہوتی ہے، اس کی اصلاح ہوتی ہے، لیکن جب لڑکی تعلیم یافتہ ہوتو وہ نہ صرف اپنے والدین، بہن بھائیوں کی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہے بلکہ اپنے رشتے دار اور پھر اپنی اولاد کے لیے بھی مشعل راہ ثابت ہوسکتی ہے۔ اس کی مثال... اچھا اچھا۔

راشد بیچ میں بول اٹھا۔ بھائی میں تو انجینئر بنوں گا۔ یہ ڈاکٹر اور ٹیچر تو بہت ہو چکے۔ ہمارے ننھیال اور ددھیال میں کوئی انجینئر بھی ہونا چاہیے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سجاد کا چھوٹا بھائی احسن آدھمکا۔ وہ سمجھا کوئی کھیل چل رہا ہے۔

میں بھی... میں بھی مجھے بھی کھیلنا ہے... اب مجھ سے پوچھو، ارے بھئی تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ کھاؤ پیو موج مستی کرو۔ نہیں دیکھو میں بڑا ہو گیا ہوں، دوڑنے لگا ہوں، اسکول بھی جانے لگا ہوں.... سینئر کے جی میں یعنی پری پرائمری ہے نا تو کیا ہوا۔ میں بھی..... میں بھی بڑا ہوں۔ پاس پڑے اسٹول پر چڑھ کر احسن نے گردن اونچی کی۔

سجاد نے مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے کہا ہاں ہاں بہت بڑے ہو گئے ہو۔ آؤ تم ہمارے ابو بن جاؤ..... چلو آؤ....

احسن نے گھبرا کر سجاد کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ نا بابا نا! ابو نہیں۔

سب ہنسنے لگے، احسن روہانسا ہو گیا۔

سجاد نے منہ پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کو کہا۔

پھر پیار سے احسن کو گود میں بٹھا کر پوچھا تم اتنا کیوں ڈر رہے ہو؟ ابو لوگوں کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ انھیں آرام نہیں ملتا اور سب کو پیسے بھی دینے پڑتے ہیں۔ تبھی صائمہ کہنے لگی: ہاں سجاد بھیا۔ پچھلے ڈیڑھ مہینے سے ابو بڑے بھیا کے داخلے کے لیے پریشان ہیں۔ سب لوگ کہتے ہیں، ابو اتنے پریشان کبھی نہیں ہوئے۔ بارہویں کے بعد سی ای ٹی میں بھیا کو کم نمبر ملے اتنی پڑھائی کرنے اور کلاس لگانے کے بعد بھی ان کے داخلے کے لیے کئی دن سے بھاگ دوڑ شروع ہے لیکن پھر بھی... ابو کتنے پریشان ہو گئے۔ بیچارے، واقعی ابو بننا مشکل کام ہے۔ احسن سچ کہتا ہے۔ احسن بھٹ صائمہ کی گود میں جا بیٹھا۔ سجاد نے کہا "ہاں صائمہ"..... ابو بننا یقیناً مشکل کام ہے لیکن جس طرح والدین سخت محنت و جانفشانی سے پیسے کماتے ہیں، بچوں کے لیے تعلیم، ٹیوشن، کتابوں کا انتظام کرتے ہیں اور اپنا فرض پورا کرتے ہیں بچوں کو بھی اپنا فرض نبھانا چاہیے اور والدین کی فرمانبرداری کرتے ہوئے دل لگا کر پڑھائی کرنی چاہیے تا کہ اچھے بچے کہلا سکیں۔ اتنا تو ہم بچے کر سکتے ہیں۔ ہے نا!

سجاد بھائی کی بات پر سب نے مل کر کہا "ہاں، بابا ہاں!"

■

Raheem Raza
2587, Raza Manzil
Ka\hirni Pura, At.: P: Yawal
Distt.: Jalgaon - 425301 (Maharashtra)

متین الدین

رواداری

جیٹھ کی چمچماتی دھوپ اور لو کے قہر نے صحرا کو پھر سے خزاں میں تبدیل کر دیا تھا۔ صحرا کے نباتات، جمادات، چرند، پرند اور سارے صحرائی جانور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اس امید میں جی رہے تھے کہ برکھا جی اب مہربان ہوں گے۔ انتظار ہی انتظار میں اساڑھ کا آدھا مہینہ بیت گیا۔ صحرا کے سارے پوکھر، تالاب، ندیاں، جھیلیں خشک ہو گئیں۔ جانوروں اور پرندوں میں ہاہاکار مچنے لگا۔ صحرا کے وہ درخت جو جانوروں اور پرندوں کے لیے آشیانہ تھے، سوکھے ہوئے جھاڑ میں تبدیل ہو گئے۔ صحرا کے جانداروں نے اس مشکل سے نکلنے کے لیے ایک ہنگامی میٹنگ طلب کی جس میں بالاتفاق یہ طے پایا کہ بچوں والے جاندار پرندوں جانوروں کو چھوڑ کر باقی سب ہجرت کر جائیں۔ قدرت کی زمین بہت وسیع ہے۔

سارے پرند و جانور قطار در قطار اپنی منزل مقصود کے لیے نکل پڑے اور ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ گئے جہاں بہت سے پرندے اور جانور اپنے بھائیوں کی میزبانی کے لیے انتظار میں کھڑے تھے۔ مہاجر جھنڈوں کی بڑی تعداد نے حاسد جانداروں کے درمیان بے چینی پیدا کر دی تھی۔ جو خوراکِ اشیا کی کمی کا سیاسی جال بچھانے میں مشغول ہو گئے جس سے صحرا میں ایک خاص ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔

ادھر جو جاندار اپنے معصوم بچوں کی وجہ سے رہ گئے تھے ان کے لیے بھی خوراک ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ سارے صحرا میں کہیں بھی کوئی اناج کا دانہ نہ تھا۔ صرف جمع خوروں اور سرکاروں نے گوداموں میں ہی اناج کے ذخیرے کو جمع کر رکھا تھا۔ جس کا بے شمار حصہ استعمال میں آئے بغیر سڑ کر برباد ہو جاتا تھا۔ سوکھا پڑنے پر ذخیروں پر نگرانی تیز ہو گئی تھی۔ ان پر ہی خراب خستہ دانا چگنے کے علاوہ ہمارے جینے کا سارے صحرا میں کوئی اور بدل نہیں تھا۔ لہٰذا سارے صحرا کے جاندار اسی ذخیرے کی طرف ٹوٹ پڑے۔

یہ بات جب بادشاہ کے دربار تک پہنچی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ سارے پرندوں اور جانوروں کو قید کرلیا جائے۔ فوراً جانوروں اور پرندوں کو قید کرلیا گیا۔ پھر بادشاہ تمام جانداروں سے مخاطب ہوا بتاؤ تمھیں کیا سزا دی جائے۔ تم نے ہمارے پہرے داروں کو بہت پریشان کررکھا ہے۔ پرندوں اور جانوروں نے مل کر کہا، بادشاہ سلامت ہمیں کوئی سزا مت دینا جب تک ہمارے صدر واپس نہ آجائیں۔

بادشاہ نے پرندوں سے کہا کہ تمھارے صدر کہاں گئے ہیں؟

پرندوں نے کہا کہ جی وہ یورپ گئے ہیں۔

بادشاہ نے تجسس بھرے انداز میں جانوروں سے بھی پوچھا کہ تمھارے صدر کہاں گئے ہیں؟

جانوروں نے بتایا کہ ہمارے صدر امریکہ گئے ہیں۔

بادشاہ نے جانوروں اور پرندوں دونوں سے مخاطب ہوکر معلوم کیا کہ تمہارے صدر یورپ اور امریکہ کیوں گئے ہوئے ہیں؟

بادشاہ سلامت وہاں پنچایت ہے اس کا فیصلہ کرنے گئے ہوئے ہیں۔ جانوروں اور پرندوں نے جواب دیا۔

بادشاہ: وہاں کس بات کی پنچایت ہے؟

جانور و پرند: جی حضور یہ تو ہمارے صدر ہی بتا سکتے ہیں۔

ان کے جواب سے بادشاہ حیرت میں پڑ گیا کہ 'جانور اور پرند اور امریکہ اور یورپ میں پنچایت' وہ بے چینی سے دونوں صدر کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

دونوں صدر جب یورپ اور امریکہ سے واپس لوٹے تو اپنے سارے پرندوں اور جانوروں کو غائب پایا۔ پوچھ تاچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ سارے صحرا کے جانداروں کو بادشاہ نے قید کرلیا ہے۔ دونوں صدر فوراً بادشاہ کے دربار پہنچ گئے اور بادشاہ سے مخاطب ہوکر عرض کرنے لگے۔ حضور والا یہ ہمارے ساتھ ناانصافی کیسی۔ ہمارے تو سارے بچے بھوکے مرجائیں گے۔ صرف بچوں والے پرندے ہی تو یہاں باقی بچے ہیں۔ باقی تو سارے جانور اور پرندے ہجرت کرچکے ہیں، یہ بھی صرف بچوں کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ بادشاہ نے کہا پہلے یہ بتاؤ کہ تم یورپ اور امریکہ کیوں گئے ہوئے تھے۔

پرندوں کے صدر نے کہا حضور وہاں پنچایت تھی اور پنچایت اس بات کی تھی کہ یورپ کے مکار و چالاک پرندوں نے سارے صحرا کے پرندوں میں غیرانسانی فطرت کا وہ زہر گھول دیا تھا جس کی وجہ سے دنیا کی ساری انسانیت پریشان ہے کہ یہ مہاجر پرندے ہمارے یہاں بھی خوراک کی قلت پیدا کردیں گے۔

تو پھر تم نے اس مسئلہ کا کیسے حل کیا؟

پرندوں کے صدر نے کہا، حضور دیکھیے قدرت کسی بھی جاندار کے پیدا ہونے سے پہلے اس کا رزق زمین پر اتار دیتی ہے تو پھر خوراک کی قلت کا مسئلہ تو پیش آ ہی نہیں سکتا۔ انسانی مثالیں عبرت کے لیے کافی ہیں۔ جو قدرت کے انعام واکرام سے کھلواڑ کررہا ہے اگر تم پرندوں نے بھی ایسا ہی کیا تو تم بھی بھرپور غذا ہونے کے باوجود بھوکے مرنے لگو گے۔ دیکھیے انسان اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے انسانوں کے لیے غذائی قلت کا مسئلہ پیدا کررہا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق آٹھ سو گیارہ ملین، لوگ آج بھی غذا کی کمی سے جوجھ رہے ہیں اور حیرت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو بھوک سے چھٹکارا پانے کے لیے جتنی خوراک و سرمائے کی ضرورت ہے دنیا میں اس سے زیادہ خوراک سرمایہ موجود ہے جس پر آپ جیسے ناخدا لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ جیسے حکمرانوں کے چاند اور مریخ پر آشیانے بسانے کا ہنر تو سیکھ لیا ہے لیکن

زمین پر بھوک سے دم توڑتا معصوم نونہال آپ کو نظر نہیں آتا۔ ہمارے یہاں ایسے انسانوں کی مثال اس گدھ کی سی ہے جسے آسمان کی بلندیاں تو پسند ہیں مگر زمین پر نظر مردار پر لگی رہتی ہے۔

صدر کی باتیں سن کر بادشاہ وہ علامتیں اپنے اندر محسوس کرنے لگا جو صدر نے کہی تھیں، لیکن جانوروں کے صدر سے بھی کچھ جاننے کا تجسس برقرار تھا، چنانچہ بادشاہ جانوروں کے صدر سے مخاطب ہوا۔

بادشاہ: ہاں بھئی تم امریکہ میں کون سی پنچایت حل کرنے گئے تھے۔

جانوروں کے صدر نے کہا کہ امریکہ میں جانوروں کی رواداری پر انسان کی گندی سیاست کا غلاف چڑھنا شروع ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے مہاجر اور مقامی جانوروں میں انتشار پھیل گیا تھا۔

بادشاہ: تو پھر تم نے اس انتشار کو کیسے ختم کیا؟

پرندوں کے صدر نے کہا کہ دیکھیے ہمارے یہاں رواداری ہے۔ امیری اور غریبی جانوروں میں نہ کوئی مسئلہ ہے اور نہ تھا اور نہ کبھی ہوگا کیونکہ ہر جانور کو روزانہ پیٹ بھر کھانا بنا کسی فکر کے قدرت کی طرف سے مل جاتا ہے، تو مال کو جمع کرنے کا ہمارے یہاں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اگر ہم نے بھی انسان کی طرح امیری اور غریبی کی چادر اوڑھ لی تو ہماری تہذیب و ثقافت جس کی بنیاد 'رواداری' ہے، ختم ہو جائے گی او رپھر ہم بھی امیری اور غریبی کے مکر جال میں پھنس کر اپنے ہی بھائیوں کی لاشیں زمین پر بچھا دیں گے جس طرح انسانی لاشوں کو دیکھ کر آج زمین کانپ رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ عقل و شعور رکھنے والے اس انسان کو کل کی تو فکر ہے لیکن آج کیا ہو رہا ہے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ انھیں کے ماہرین کے مطابق آج 42 ملین لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کی بروقت مدد نہ کی گئی تو فاقہ کشی انھیں موت کے دہانے پر کھڑا کر دے گی۔ 14 ملین معصوم بچے ناقص غذا سے ہونے والے مسائل سے دوچار ہیں، جبکہ ایسا نہیں کہ غذا کی قلت ہو، غذا تو بھرپور مقدار میں موجود ہے۔

اقوام متحدہ کے ورلڈ فوڈ پروگرام کے ڈائرکٹر ڈیوڈ بنسلی نے سی این این کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ایلن سک اور جیف بیزوز جیسے سرمایہ دار اپنی دولت کا 2 فیصد اور 3 فیصد بھی ورلڈ فوڈ پروگرام کی نذر کر دیں تو دنیا کے 42 ملین لوگوں کے آنسو پونچھے جا سکتے ہیں یا پھر امریکہ کے 400 ارب پتی جن کی دولت کا ایک فیصد بھی اس کار خیر کے لیے کافی ہوگا، لیکن انسان قدرت کے اصول کو بھول چکا ہے 'رواداری' جو انسان کا شاہکار تھا اس کے مقابلے میں دولت جمع کرنے کو اس نے اپنا شاہکار بنا لیا ہے اور اس دولت کے اوپر سانپ کی شکل میں پہرہ دار بن کر بیٹھ گیا ہے جس کا خمیازہ عام انسان کو بھگتنا پڑتا ہے۔ بادشاہ پرندوں اور جانوروں کی گفتگو کی ساری علامتیں اپنے اندر محسوس کرنے لگا اور شرمسار ہو کر سارے پرندوں اور جانوروں کو آزاد کر دیا۔

پیارے بچو! یہ ایک خیالی کہانی ہے جو آپ سے مطالبہ کر رہی ہے کہ کائنات میں قدرت کا دیا ہوا ایک شاہکار زیور 'رواداری' ہے جسے ہم انسانوں نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ آؤ آج ہم عزم کریں کہ قدرت کے اس شاہکار زیور 'رواداری' کو انسانوں میں عام کریں گے۔

■

Matinuddin
T&P: Umrikalan
Distt.: Moradabad- 244501 (UP)
Mob.: 9690287383

ضیاء الحسن

ایک گلاس دودھ

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ مہاراشٹر کے ایک چھوٹے شہر 'ہنگولی' میں 'پرتاپ' نام کا لڑکا رہتا تھا۔ اس کا تعلق ایک شریف اور خوش حال گھرانے سے تھا۔ مگر حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ چنانچہ اس خاندان پر مصیبتوں کے اتنے پہاڑ ٹوٹے کہ وہ لوگ بے سہارا ہوگئے۔ پرتاپ کی عمر بہت کم تھی لیکن اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک ذہین لڑکا تھا۔ مالی حالت خراب رہنے کے باوجود وہ خوب دل لگا کر پڑھتا۔ پابندی سے اسکول جاتا۔ وقت پر اپنا ہوم ورک کرتا۔ اسکول کے ٹیچر اس سے خوش رہتے اور اس کی ہمت بڑھاتے۔ وہ ماں باپ کی ہر بات سنتا اور اس پر عمل کرتا۔ اس نے کسی چیز کے لیے کبھی ضد نہیں کی۔ ماں باپ کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اس کے لیے نئی نئی کاپیاں خرید سکیں۔ اس لیے کاپیوں پر وہ پنسل سے لکھتا اور پھر اسے ربر سے مٹا کر انھیں دوبارہ استعمال کرتا۔ بہر حال طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا کر اس نے ہائی اسکول کی تعلیم پوری کی۔ پھر انٹر میڈیٹ یعنی گیارہویں اور بارہویں کا امتحان اورنگ آباد کے اس کالج سے پاس کیا جس کے پرنسپل کبھی بابائے اردو مولوی عبدالحق ہوا کرتے تھے۔ پرتاپ کے دل میں آگے پڑھنے کی خواہش تھی۔ مگر اعلیٰ تعلیم صرف حیدر آباد میں رہ کر حاصل کی جاسکتی تھی۔ گھر والے اتنا خرچ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دور کے ایک رشتہ دار نے حیدر آباد سے یہ کہلوا بھیجا کہ پرتاپ کو پڑھائی کے لیے ان کے گھر بھیج دیں۔ اس اطلاع پر گھر کے سب لوگ خوش ہو گئے۔

چنانچہ حیدر آباد جا کر اس نے عثمانیہ یونیورسٹی کے بی اے کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ وہ اپنے رشتے دار کے گھر میں رہ کر رات دن بڑی محنت سے پڑھنے لگا۔ کھانے کے لیے جو کچھ ملتا وہ خدا کا شکر ادا کر کے کھا لیتا۔ پہننے کے لیے کپڑوں کے صرف دو جوڑے تھے۔ وہی دھوتا اور پہنتا۔ کام کاج میں اپنے رشتے دار کا ہاتھ بٹاتا۔

ایک دن بے چارے کا جی چاہا کہ گلاس بھر دودھ پیے۔

اس نے رشتے دار سے اپنے دل کی بات کہی۔ پتہ نہیں وہ کس موڈ میں تھے۔ انھوں نے پرتاپ کو بری طرح جھڑک دیا، بولے ''ہم تجھے اپنے گھر میں رکھ کر پڑھا لکھا رہے ہیں۔ کھانا کھلا رہے ہیں، اب کیا تجھے پینے کے لیے دودھ بھی لا کر دیں۔'' یہ سن کر پرتاپ کو بہت برا لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن وہ خاموش رہا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ ''میں جب تک خود کمانے نہ لگ جاؤں، دودھ کے گلاس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔'' وہ بہت خود دار لڑکا تھا۔ اپنے فیصلے پر مضبوطی سے قائم رہا۔

دو سال بعد وہ اچھے نمبروں سے بی اے پاس ہو گیا اور اسے ٹیچر کی نوکری مل گئی۔ وہ ریاضی کا قابل استاد بن چکا تھا۔ اسکول کے طلبا اسے چاہتے تھے۔ اعلیٰ عہدے دار اس کی قدر کرتے۔ اب وہ پرتاپ راؤ حیات نگر کے نام سے مشہور ہو چکا تھا۔ اسکول کے بچے ادب سے انھیں 'پرتاپ راؤ گروجی' کہتے۔ انھوں نے آسان زبان میں ریاضی کی ایک کتاب لکھی جس سے طالب علموں کو ریاضی سیکھنے میں بہت مدد ملی۔

پرتاپ راؤ کی تعلیم اردو زبان میں ہوئی۔ مراٹھی تو خیر ان کی مادری زبان تھی۔ انگریزی کے بھی وہ ماہر تھے۔ کچھ سال بعد انھیں ترقی ملی اور وہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر بن گئے۔ وہ ضلع ایجوکیشن افسر بھی رہے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن (جہاں ٹیچروں کو ٹریننگ دی جاتی ہے) میں پرنسپل کے عہدے پر کام کیا۔ وہ ایک محنتی استاد اور ایماندار افسر تھے۔ اسکول میں بچوں کو محنت سے پڑھاتے اور ضرورت مند ذہین بچوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ہمارے ایک استاد محمد سلیمان صاحب جو اس وقت اسکول میں پڑھتے تھے، گروجی نے انھیں بھی سرکاری وظیفہ دلوایا تھا۔

پرتاپ راؤ کے بچوں نے ہمیشہ اپنے والد کی نصیحتوں پر عمل کیا۔ ان کا ایک لڑکا ڈسٹرکٹ جج (ضلع کا سب سے بڑا جج) اور دوسرا میڈیکل کالج کا پروفیسر بنا۔ ایک اور لڑکا امریکی کمپنی میں افسر ہے۔

پرتاپ راؤ مضبوط ارادوں کے مالک تھے۔ انھوں نے دودھ کے گلاس کو اس وقت تک نہیں چھوا جب تک وہ خود کمانے نہیں لگ گئے۔ ان کے فرماں بردار لڑکے اپنے والد کو ان کی آخری عمر تک روزانہ رات میں سونے سے پہلے ایک گلاس دودھ پیش کرنا نہیں بھولتے تھے۔

بچو! یہ ساری باتیں ہمیں ان کے ایک لڑکے جو کامرس کے پروفیسر اور ہمارے دوست ہیں، نے بتائیں۔ پرتاپ راؤ گروجی اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر لوگ آج بھی انھیں یاد کرتے ہیں۔

■

Dr. Ziaul Hasan
HZT, Peerburhan Chowk
Lane 15
Nanded - 431605 (Maharashtra)
Mob.: 9764127458

اور کتابیں رو پڑیں

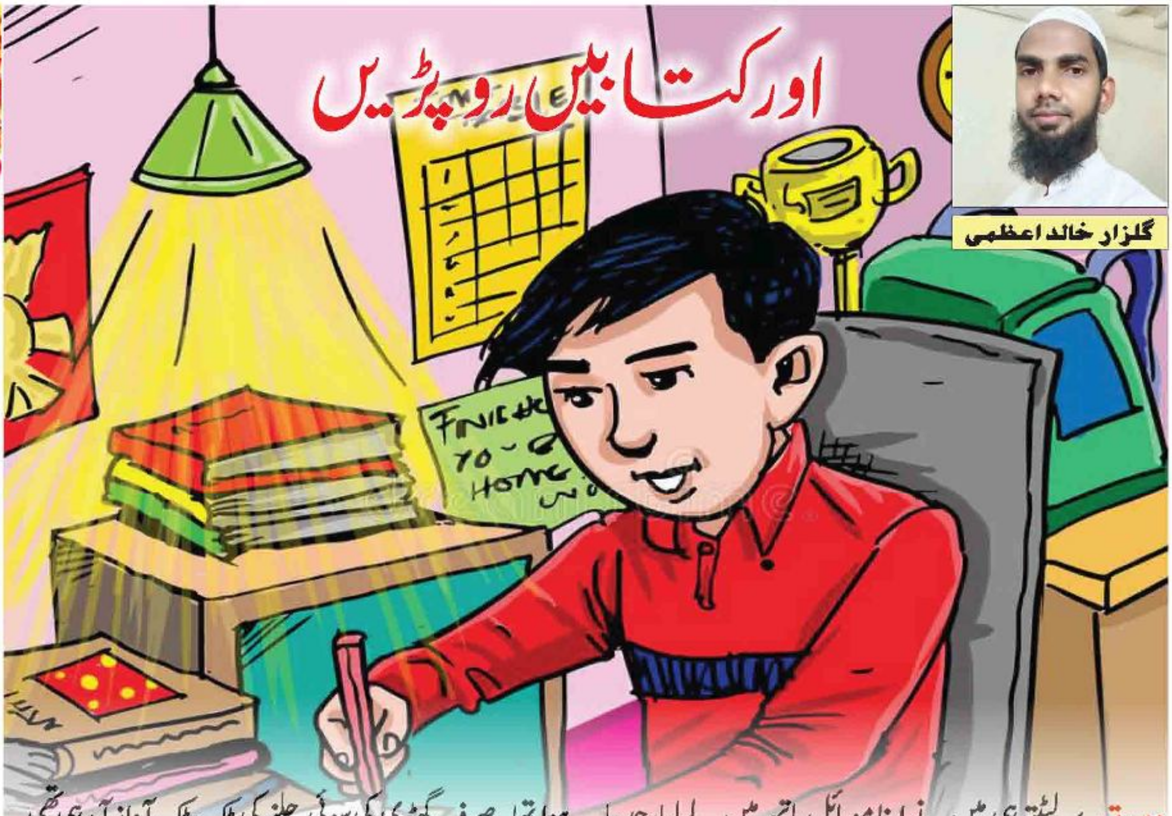

گلزار خالد اعظمی

بستر پر لیٹتے ہی میں نے اپنا موبائل ہاتھ میں لے لیا، جیسا کہ میرا روز کا ہی معمول بن چکا تھا۔ پھر موبائل کی اسکرین پر میری انگلیاں چلنے لگیں اور چند ہی منٹ میں موبائل کے فنکشن نے مجھے ایسا جکڑا کہ دو تین گھنٹے مکمل مشغول رہنے کے بعد بھی میرا دل نہیں بھرا۔ فیس بک، یوٹیوب، واٹس ایپ کے پیغامات اور پھر طرح طرح کے فضول سے پروگرام دیکھتا رہا تقریباً تین گھنٹے گزر جانے کے بعد میں نے جبراً اپنا موبائل بند کر کے تکیے کے نیچے رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بظاہر میری آنکھیں بند تھیں مگر میں پوری طرح جاگ رہا تھا۔ میں بہت دیر تک آنکھیں موندے نیند لانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ اسی دوران میری آنکھیں یک لخت کھل گئیں۔ سامنے الماری پر میری بہت سی کتابیں بے ترتیب سی پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف گھڑی کی سوئی چلنے کی ٹک، ٹک آواز آ رہی تھی۔ میری نظریں اب کتابوں کی الماری پر ٹک گئی تھیں اور میں اپنے ماضی میں کھو گیا۔

وہ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اور میں بورڈنگ میں قیام پذیر تھا۔ مجھے اس وقت کتابوں کا جنون سوار تھا۔ درسی کتابوں کے بعد خالی اوقات میں غیر درسی کتابیں پڑھنا میرا مشغلہ بن گیا تھا۔ چھٹی کے بعد جب سارے بچے کھیلنے چلے جاتے تو میں کتابیں لیے کمرے میں بیٹھ جاتا۔ میرے دوست واحباب جب بھی مجھے کہیں گھومنے چلنے کو کہتے تو میں انکار کر دیتا اور اپنے مطالعے میں مشغول ہو جاتا، یہاں تک کہ مغرب کی اذان ہو جاتی۔

وقت کم ہوتا تھا مگر میری لگن یہ تھی کہ کتابیں کم پڑ جاتی تھیں۔ میں کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا۔ پیسے کم ہوتے تھے جس کی وجہ سے مجھے پریشانی ہوتی تھی، اسی دوران مجھے دوستوں نے لائبریری کے بارے میں بتایا۔ ساتھ میں یہ بھی بتایا

کہ وہاں کتابیں پڑھنے کے لیے مفت میں دی جاتی ہیں اور پڑھ کر کتابیں واپس کردی جاتی ہیں۔ لائبریری کے بارے میں میں نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ بہت خوش ہوا، اور اگلے ہی روز میں نے لائبریری تلاش کرنی شروع کردی تھی۔

شام کا وقت تھا، بازار سے ہوتے ہوئے میں ایک سنسان سڑک پر آچکا تھا جو میری مطلوبہ جگہ تھی۔ کچھ دور چل کر ایک پتلی سی سڑک نظر آئی، دہانے پر لائبریری کا بورڈ لگا دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں جلدی سے لائبریری کی اس گلی میں داخل ہوگیا۔ لائبریری مکان کے اوپری حصے میں تھی۔ میں خوشی اور جھجک کی سی کیفیت میں سیڑھیاں چڑھتا گیا، چڑھتا گیا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی بائیں جانب کاؤنٹر پر دو شخص نظر آئے جو کتابوں کے جاری کرنے اور واپسی کی تفصیلات لکھ رہے تھے۔ میں سیدھا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ صاحبان اپنے کاموں میں مشغول رہے۔ فرصت کے بعد انھوں نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے فوراً کہا ''مجھے کچھ کتابیں چاہئیں۔'' انھوں نے ایک کمرے کی طرف مجھے جانے کو اشارہ کیا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئے۔ میں ان کے اشارے کی جانب بڑھا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی، میں نے دیکھا سامنے ایک بڑا سا کمرہ کتابوں سے مکمل بھرا ہوا تھا، رنگ برنگی کتابوں سے سجا کمرہ بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ جگہ جگہ کچھ کتابیں چھوٹی چھوٹی تپائیوں پر بھی رکھی تھیں۔ کچھ لوگ کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول تھے، کچھ اپنی مطلوبہ کتاب تلاش کررہے تھے۔ کچھ لوگ کسی کتاب کے بارے میں آپس میں باتیں کررہے تھے۔ میں بھی فوراً لائبریری میں اندر داخل ہوگیا۔ اور کتابوں کی تلاش شروع کردی۔ یہ کتاب، وہ کتاب، ایک دیکھتا پھر دوسری کتاب اس سے زیادہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کی طرف بڑھ جاتا، پھر تیسری...... ذہن میں خیال آتا کاش یہ سب کتابیں میری ہوتیں۔ کاش یہ سب کتابیں مجھے مل جاتیں۔ خیر اس روز میں نے لائبریری سے بہت ساری کتابیں لیں اور چند ہی دن میں وہ کتابیں پڑھ ڈالیں۔

اب میں ہفتے میں دو تین بار لائبریری جاتا اور کتابیں لا کر پڑھتا۔ جمعرات کو جب بورڈنگ کی چھٹی ہوتی اور گھر جانا ہوتا، تو بدھ کی شام ہی کتابوں کا انتظام کر لیتا، میری دیکھا دیکھی اور دوستوں نے بھی کتابیں پڑھنا شروع کر دیا تھا، سلسلہ چلتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرا آخری سال بھی گزرنے کے قریب آ گیا۔ پھر ایک دن ایسا بھی ہوا کہ مجھے وہ اسکول چھوڑنا پڑا۔ اسکول چھوڑنے کے بعد بھی میں مطالعہ کرتا رہا۔

بستر پر لیٹے لیٹے میں اپنے تخیلات کی دنیا میں مگن تھا۔ تبھی گھڑی نے ٹن، ٹن کی آواز سے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے ایک بجنے کا اعلان کردیا، اور میرے تخیلات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ میری آنکھیں اب بھی اپنی کتابوں کی الماری پر ٹکی ہوئی تھیں، لیکن میں تخیلات کے سمندر سے نکل چکا تھا، الماری پر کتابیں بے ترتیب سی پڑی تھیں۔ جنھیں میں کبھی بہت شوق سے خرید کر لاتا، اور رات رات تک پڑھتا رہتا تھا، بہت ہی احترام سے انھیں رکھتا، اور ان کتابوں کی دیکھ بھال کرتا، ہر وقت ایک کتاب میرے ساتھ ہوا کرتی تھی جس کا میں فرصت ملتے ہی مطالعہ کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ مگر آج وہی سب کتابیں گرد وغبار سے اٹی، لاوارث کی طرح الماری پر بکھری پڑی تھیں۔ مجھے ان کتابوں کو ہاتھ لگائے ہوئے کئی سال گزر گئے تھے، بلکہ یوں کہیے کہ میرا دھیان کتابوں سے بالکل ہٹ گیا تھا، اور میں ان کتابوں کو بالکل بھول چکا تھا۔

آج میں ان کتابوں کو اپنے بستر پر لیٹے لیٹے غور سے

دیکھ رہا تھا، ان کتابوں کو آج سے پہلے میں نے کبھی اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ الماری پر نئی کتابوں کے ساتھ ساتھ بہت سی کتابیں ایسی بھی تھیں جو اپنے سرورق سے محروم ہو چکی تھیں۔ میں انھیں غور سے دیکھنے لگا۔ کچھ اوراق کتاب سے علیحدہ ہو کر الماری سے لٹک رہے تھے۔ ذرا دیر کے لیے میرے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی اور میں اٹھنے ہی والا تھا کہ انھیں درست کروں مگر اچانک مجھے ایسا لگا جیسے اوراق پھڑ پھڑانے لگے ہوں اور کتابیں چیخنے لگی ہوں اور چیخ چیخ کر اپنی زبان حال سے کہہ رہی ہوں۔

"میاں رہنے دو...... رہنے دو ہمیں...... ہماری اس خستہ حالی کا تمھیں آج خیال آیا!...... ارے تم وہی ہونا جو ہم سے محبت کا دم بھرا کرتے تھے...... اور ہاں تم کیا کہتے تھے......؟ تم کہتے تھے کہ ہم کو کتابوں سے بہت محبت ہے، کتابیں ہماری دوست ہیں...... کتابوں کے بغیر نیند نہیں آتی......ارے او! بے وفا انسان: تمھیں کیا ہو گیا، تم تو ایسے نہ تھے۔ ہمیں اس طرح رکھ کر سالوں سال کے لیے تم ہم سے بے پروا ہو گئے۔ کیا تم نے ہمیں نمود و ریاکاری کے لیے رکھا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمھارے دوست و احباب الماری پر ہمیں رکھا دیکھ کر تمھیں ایک اچھا اور باذوق قاری تصور کریں۔ تمھیں ایک پڑھا لکھا آدمی سمجھیں......"

"نہیں نہیں...... ہرگز نہیں تم ایسے نہیں ہو سکتے...... تمھیں اب کتابوں سے بالکل بھی محبت نہیں۔ تمھیں تو اب انٹرنیٹ سے محبت ہو گئی ہے۔ تم تو اب انٹرنیٹ کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتے۔"

چیختے چیختے ان اوراق کی آواز پر لرزہ طاری ہو گیا تھا ،لیکن پھر بھی بے بس مظلوم کی طرح مزید انھوں نے کہنا شروع کیا۔

"تمھارے تکیہ کی وہ جگہ جہاں تم کبھی محبت سے ہم کتابوں کو رکھا کرتے تھے، آج وہ جگہ تم نے انٹرنیٹ کے اس ملٹی میڈیا موبائل کے کو دے رکھی ہے۔ ہاں، ہاں۔ ابھی بھی تمھارے تکیے کے نیچے موبائل رکھا ہوا ہے، تم دیکھو تو سہی۔ خدارا اب تم ہم سے محبت کے دم بھرنا چھوڑ دو......"

"اور ہاں...... ایک بات اور یاد رکھو، ہم کتابیں انسانوں کو علم کے ساتھ ساتھ تہذیب بھی سکھاتی ہیں، فہم و فراست کو وسعت اور تخیل کو اونچی اڑان دیتی ہیں، انسان کو طریقہ گفتار سکھاتی ہیں۔ مگر افسوس......! افسوس کہ تم انسانوں نے ہمارے ساتھ بہت بے وفائی کی......۔ ہم علم و آگہی کے اوراق کو بے یار و مددگار، گرد و غبار میں لپٹا چھوڑ کر فضولیات میں مگن ہو گئے ہو۔"

آواز کی لرزش میں وہ اوراق اور نہ جانے کیا کیا کہتے گئے۔ میری نگاہیں اب بھی اس الماری پر ٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے خود پر بہت شرمندگی ہو رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا، اور موجودہ صورت حال پر افسوس کرتے ہوئے خود اپنے گریبان میں جھانکنے لگا۔

اب وہ اوراق میرے شب روز کی تلخ حقیقت کو بیان کرتے کرتے ہانپتے ہوئے خاموش ہو چکے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ اٹھ کر ان کتابوں کو صحیح طریقے سے الماری پر رکھ دوں۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں انھیں درست کرنے کے لیے اٹھتا۔ نم دیدہ اوراق خود بخود کتابوں میں سمٹ گئے اور کتابیں رو پڑیں۔

■

Gulzar Khalid Azmi
Khuda Dad Islamia School
Khuda Dadpur, Sanjarpur
Azamgarh- 223227 (UP)
Mob.: 7275484547

سلام بن عثمان

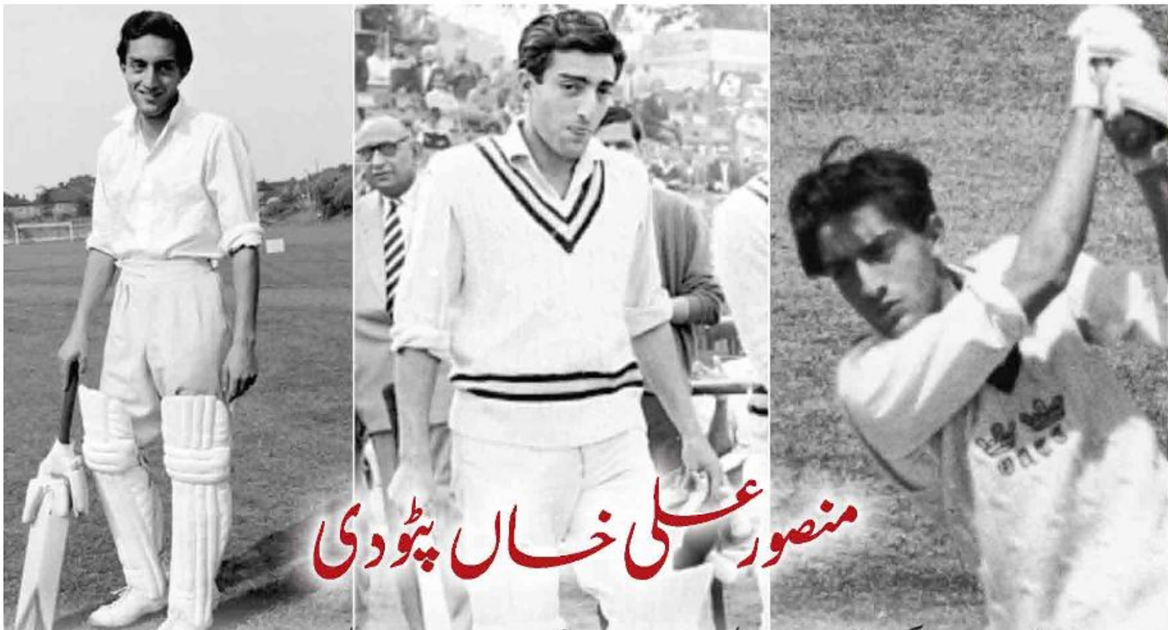

منصور علی خاں پٹودی

ٹیم انڈیا کے سب سے کم عمر کپتان منصور علی خاں پٹوڈی نے ٹائیگر پٹوڈی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ 21 سال کی عمر میں ٹیم انڈیا کے کپتان بنے اور ٹائیگر کے خطاب سے نوازے گئے۔ برٹش انڈیا کے بھوپال شہر میں 5 جنوری 1941 میں پیدا ہوئے۔ والدہ ساجدہ سلطان اور والد افتخار علی خاں پٹوڈی۔ ٹیم انڈیا کے بہترین کھلاڑیوں میں والد افتخار علی خاں پٹوڈی کا شمار تھا۔ افتخار علی خان پٹوڈی کرکٹ کی دنیا کے معروف کرکٹر تھے۔ ویسے تو پٹوڈی خاندان کا تعلق افغانستان کے شہر قندھار کے بڑوچ قبیلے سے تھا۔ ساتھ ہی نسلی پشتون فیض طالب خان سے ہیں، جو 1804 میں پٹوڈی ریاست کے پہلے نواب تھے۔

منصور علی خاں پٹوڈی نے علی گڑھ منٹور سرکل اور دہرادون کے ویلہیم بوائز اسکول کے علاوہ ہارڈ فورڈ شائر کے لاکر پارک اسکول سے تعلیم حاصل کی اور اسی اسکول میں منصور علی خاں پٹوڈی کو فرینک وولی نے کرکٹ کی کوچنگ دی۔ منصور علی خاں پٹوڈی نے آکسفورڈ کے بالیول کالج سے عربی اور فرانسیسی تعلیم بھی حاصل کی۔ افتخار علی خاں پٹوڈی دہلی کے میدان میں پولو کھیلتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ اس وقت منصور علی خاں پٹوڈی صرف گیارہ سال کے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد منصور علی خاں پٹوڈی نویں نواب کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1947 میں برطانوی حکومت کے خاتمے کے بعد ہندوستان کو آزادی ملی۔ ساتھ ہی پٹوڈی کی علیحدہ شاہی ریاست ہندوستان میں شامل کر لی گئی۔ مگر 1971 تک حکومت ہند نے 26 ویں آئین میں ترمیم کے وقت نوابی حقوق کو ختم نہیں کیا۔

منصور علی خاں پٹوڈی دائیں ہاتھ کے بہترین بلے بازی کے علاوہ دائیں ہاتھ کے بہترین تیز گیند باز کی وجہ سے کرکٹ کے میدان میں اپنی زبردست شناخت بنا چکے تھے۔ منصور علی خاں پٹوڈی انگلینڈ کے ونچسٹر کے میدان میں بلے بازی کرنے والا اسکولی بچہ جو گیند کو سزا دینے کے لیے اپنی بہترین نظروں سے بلے بازی کے لیے مشہور تھے۔ 1959 میں اسکول کے زمانے میں ٹیم کی کپتانی بھی کی۔ اس سیزن میں منصور علی خاں پٹوڈی نے 1068 تیز رنز بنائے۔ اس وقت کے ڈگلس جارڈون اسکول کے ریکارڈ کو توڑا۔ اپنے ساتھی کرسٹوفر اسنیل کے ساتھ بہترین اشترا کی اننگ کھیلتے ہوئے اسکول کی

چیمپیئن شپ بھی جیتی۔

منصور علی خاں پٹوڈی نے 16 سال کی عمر میں اگست 1957 میں سیسکس کے لیے اپنا پہلا فرسٹ کلاس میچ کھیلا اور پہلے ہندوستانی کپتان بھی رہے۔ یکم جولائی 1961 کو ایک کار کے ذریعے کہیں جارہے تھے۔ اس سے قبل اس کار کا حادثہ پیش آچکا تھا۔ اس وقت ایک اور حادثہ پیش آیا۔ فوری بریک کے استعمال سے ایک زبردست جھٹکا لگنے سے کار کے ونڈ اسکرین سے شیشے کا ایک ٹکڑا منصور علی خاں پٹوڈی کی دائیں آنکھ میں گھس گیا۔ جس کی وجہ سے دائیں آنکھ کی روشنی کو مستقل طور پر نقصان پہنچا۔ اس وقت یہ خدشہ تھا کہ اس حادثے سے منصور علی خاں پٹوڈی کا کرکٹ کریئر ختم ہو جائے گا۔ مگر منصور علی خاں پٹوڈی پورے اعتماد کے ساتھ جلد ہی نیٹ پریکٹس کے لیے کرکٹ کے میدان میں آئے۔ ایک آنکھ سے دیکھ کر کھیلنا شروع کیا۔ چھ ماہ سے بھی کم عرصے میں اپنی آنکھ کی چوٹ کے باوجود انھوں نے دسمبر 1961 میں دہلی میں انگلینڈ کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلتے ہوئے ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز کیا۔ منصور علی خاں پٹوڈی حادثے والی آنکھ پر ٹوپی تھوڑا نیچے کی طرف کھینچ لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے انھیں تیز گیند کا سامنے کرنے سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ منصور علی خاں پٹوڈی کرکٹ کے میدان میں بلے بازی میں قدم پوری طرح جمع لیے۔ اسی انداز میں منصور علی خاں پٹوڈی بہترین بلے بازی کرتے ہوئے مدراس میں تیسرے ٹیسٹ میں بہترین 103 رنز بنائے۔ ان کی بہترین بلے بازی کی وجہ سے ٹیم انڈیا کو پہلی مرتبہ سیریز میں فتح حاصل ہوئی۔ اس کے بعد 1962 میں ویسٹ انڈیز کے دورے کے وقت منصور علی خاں پٹوڈی کو نائب کپتان کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد مارچ 1962 میں منصور علی خاں پٹوڈی ٹیم انڈیا کے کپتان بن گئے۔ اس وقت منصور علی خاں پٹوڈی صرف 21 سال 77 دن کے تھے۔ سب سے کم عمر ٹیسٹ کپتان کا عالمی ریکارڈ اپنے نام کیا۔ اس طرح منصور علی خاں پٹوڈی 2015 تک سب سے کم عمر ٹیسٹ کپتان اور بین الاقوامی سطح پر دوسرے نمبر پر رہے۔

منصور علی خاں پٹوڈی 1961 سے 1975 تک 46 ٹیسٹ میچ کھیلے اور 2793 رنز بنائے جس میں چھ سنچریاں اور 17 نصف سنچریاں شامل ہیں۔ میدان میں فیلڈنگ کے وقت گیند کبھی ان کے ہاتھوں کو چکما نہیں دے سکا۔ منصور علی خاں پٹوڈی تیزی سے گیند پر جھپٹ پڑتے تھے جس کی وجہ سے فیلڈنگ کے ذریعے کئی رنز بننے سے بچا لیتے تھے۔ اس وجہ سے وہ ٹائیگر پٹوڈی کے خطاب سے نوازے گئے۔ انھیں کرکٹ کے میدان میں ٹائیگر پٹوڈی کی شناخت ملی۔ 46 ٹیسٹ میچ میں 40 ٹیسٹ میچ میں کپتان رہے۔ 9 ٹیسٹ میچ میں کامیابی حاصل کی۔ 19 میچ میں شکست اور 19 ٹیسٹ میچ برابری پر ختم ہوئے۔ 1968 میں نیوزی لینڈ کے خلاف پہلے ٹیسٹ میچ کی فتح بھی حاصل کی۔ ٹیم انڈیا کے لیے بیرونی ملک میں ٹیسٹ سیریز جیتنے کا اعزاز بھی منصور علی خاں پٹوڈی کے نام ہے۔ 1970 میں ویسٹ انڈیز دورہ کے لیے منصور علی خاں پٹوڈی کی جگہ کسی اور کو کپتان بنایا گیا۔ جس کی وجہ سے 1970 سے 1972 تک ٹیسٹ میچ نہیں کھیلا۔ 1973 میں اجیت واڈیکر کی کپتانی میں انگلینڈ کے خلاف تیسرے ٹیسٹ کے لیے ٹیم انڈیا میں شامل ہوئے۔ 75-1974 میں ویسٹ انڈیز کے خلاف پھر ایک مرتبہ ٹیم انڈیا کے کپتان بنے، اس کے بعد 1975 میں ٹیسٹ کرکٹ سے کنارہ کشی اختیار کی۔

1957 سے 1970 کے درمیان منصور علی خاں پٹوڈی نے اپنے ہم وطنوں رنجیت سنگھ اور دلیپ سنگھ کی پیروی کرتے ہوئے سیسکس کاؤنٹی کرکٹ کلب کے لیے 137 فرسٹ کلاس

میچ کھیلے جس میں 3054 رنز بنائے۔ 1966 میں سیسکس کی کپتانی بھی کی۔اسی دوران ہندوستان میں نارتھ زون دہلی اور پھر ساوتھ زون حیدرآباد کے لیے فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلا۔ 1962 میں انڈین کرکٹ آف دی ائیر اور 1968 میں وزڈن کرکٹر آف دی ائیر کے اعزاز سے نوازے گئے۔انھوں نے 1969 میں اپنی خودنوشت ٹائیگر ٹیل کتاب شائع کی۔ 1975 میں ٹیم انڈیا کے مینیجر کے عہدے پر فائز رہے۔اس کے بعد انڈین پریمیئر لیگ کونسل کے رکن رہے۔ 2007 میں ٹیم انڈیا کے ٹیسٹ میچ میں 75 ویں سالگرہ کے وقت ملبورن کرکٹ کلب نے ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان ایک ٹیسٹ سیریز ٹرافی رکھی گئی جسے ان کے والد افتخار علی خاں پٹوڈی ٹرافی کا نام دیا گیا۔

منصور علی خاں پٹوڈی ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں چھٹے نمبر پر بلے بازی کرتے ہوئے ایک ہی ٹیسٹ میچ میں ایک آنکھ کے ذریعے سب سے زیادہ 554 گیند کھیلنے کا ریکارڈ بھی ان کے پاس ہے۔

منصور علی خاں پٹوڈی نے اپنا پہلا ٹیسٹ میچ 13 دسمبر 1961 کو انگلینڈ کے خلاف کھیلا۔اور اپنا آخری ٹیسٹ میچ 23 جنوری 1975 میں کھیلا۔ اپنے 46 ٹیسٹ میچوں میں 2793 رنز بنائے جن میں چھ سنچریاں اور 17 نصف سنچریاں شامل ہیں۔بہترین کارکردگی 203 رنز ناٹ آؤٹ ہے۔گیند بازی میں صرف ایک وکٹ اور شاندار 27 کیچ شامل ہیں۔

فرسٹ کلاس کرکٹ میں 310 میچوں میں 15425 رنز بنائے۔جس میں 33 سنچریاں اور 75 نصف سنچریاں شامل ہیں۔203 رنز ناٹ آؤٹ بہترین اسکور ہے۔گیند بازی میں 10 وکٹیں حاصل کیں۔بہترین گیند بازی رہی بغیر کوئی رنز دیے ہوئے ایک وکٹ کے ساتھ 208 بہترین کیچ بھی شامل ہیں۔

منصور علی خاں پٹوڈی کے مشہور فلم اداکارہ سیمی گریوال کے ساتھ بہت اچھے مراسم تھے،جس کی وجہ سے ان کا نام سیمی گریوال کے ساتھ جوڑا جاتا تھا۔اسی درمیان ایک روز شرمیلا ٹیگور سے ملاقات ہوئی۔منصور علی خاں پٹوڈی پہلی ہی نظر میں شرمیلا ٹیگور کو دل دے بیٹھے۔شرمیلا ٹیگور سے ملاقات کا سلسلہ چل پڑا۔منصور علی خاں پٹوڈی نے اس وقت شرمیلا ٹیگور کو ایک قیمتی ریفریجریٹر تحفے میں دیا۔شرمیلا ٹیگور نے منصور علی خاں پٹوڈی سے ایک روز کہا اگر تم تین گیندوں پر تین چھکے مارتے ہو تو میں تم سے شادی کروں گی۔ پھر کیا تھا پٹودی نے بات کو قبول کرتے ہوئے اگلے ہی میچ میں اپنا وعدہ پورا کیا تین گیندوں پر تین چھکے مارے۔27 دسمبر 1968 کو شرمیلا ٹیگور کو اپنی شریک حیات بنایا۔ان کے تین بچے ہیں جن میں 1970 کو سیف علی خاں پیدا ہوئے۔ بالی ووڈ کے مشہور سپر اسٹار ہیں۔صبا علی خان 1976 کو پیدا ہوئیں جیولری ڈیزائنرز ہیں۔ 1978 کو سوہا علی خان مشہور بالی ووڈ اور ٹی وی اداکارہ ہیں۔ مشہور اداکارہ کرینہ کپور ان کی بہو ہیں۔سارہ علی خاں ان کی پوتی ہیں۔سارہ علی خاں کی والدہ امریتا سنگھ ہیں۔ پوتے تیمور علی خاں کی والدہ کرینہ کپور ہیں۔

منصور علی خاں پٹوڈی کو ہندوستان کے بہت بڑے ارجن ایوارڈ سے نوازا گیا۔

22 دسمبر 2011 کو دہلی کے سرگنگا رام اسپتال میں منصور علی خاں پٹوڈی نے آخری سانس لی۔آخری رسم تدفین ان کے آبائی وطن پٹودی ہریانہ میں ادا کی گئی۔

■

Salam Bin Usman
Flat no.2 Nanda Deep bldg.
Brahaman Wadi, M.P Road, Kurla West
Mumbai- 70 (Maharashtra)
Email.: salusmansk@gmail.com
Mob.: 9821557359

روشنی کا سفر

شاھد حبیب

جمیل اختر شفیق کے تعارف کے کئی حوالے ہیں۔ وہ شاعر کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور مشاعروں میں اپنی خوبصورت ترنم کی بدولت جہاں محفل لوٹنے میں کامیاب رہتے ہیں وہیں ملک و بیرونِ ممالک کے رسائل وجرائد میں اپنی غزلوں ونظموں کی اشاعت سے قارئین کی ایک بڑی تعداد کو متاثر بھی کر لے جاتے ہیں۔ 2018 میں ان کا شعری مجموعہ 'دھوپ کا مسافر' شائع ہوا تو ناقدین کی ایک بڑی تعداد نے ان کے فکروفن پر مضامین لکھے اور ان کی انفرادیت اور امتیازات کو واضح کیا۔ جمیل اختر شفیق کے تعارف کا ایک بڑا حوالہ ان کا دلپذیر مقرر ہونا بھی ہے۔ وہ دینی، اصلاحی اور عصری مسائل پر جب لب کشائی کرتے ہیں تو لاکھوں کا مجمع ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ حالات حاضرہ کے موضوعات کی سمجھ نے انھیں کئی حیثیتوں سے فائدہ پہنچایا۔ اپنے زیرِ تدریس طلبہ میں مقبولیت عطا کی تو سیاسی گلیاروں کا بھی ڈلارا بنایا، اپنی شاعری کے لیے خام مواد کی تلاش میں مدد دی تو کہانیوں کے نئے موضوعات کی طرف رہنمائی بھی کی۔ مطالعے کے شوق کی وجہ سے وہ تنقیدی مضامین لکھنے پر بھی قدرت حاصل کر چکے ہیں اور ڈیڑھ دہائی سے بچوں کے لیے اصلاحی وتمثیلی کہانیاں لکھ کر ادبِ اطفال کے بھی مقبول ادیب بن چکے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب ان کی بچوں کے لیے لکھی گئی ڈھائی سو سے زائد کہانیوں کے انتخابات کا پہلا نقش ہے۔

اس مجموعے میں جمیل اختر شفیق نے اپنی جن کہانیوں کو شامل کیا ہے، اسے ادبی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے بچوں کی اخلاقی تعمیر کی نظر سے دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور حقیقت یہی ہے کہ آج ادبِ اطفال کے نام پر جن تحریروں کا وجود عمل میں آرہا ہے، ان میں تعمیرِ اخلاق کے پہلوؤں سے صرفِ نظر کر کے اساطیری وغیر منطقی لوازمات کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہے اور اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ بچوں کی دلچسپی کو بنائے رکھنے اور ان کے اندر مطالعے کا شوق پیدا کرنے کیلیے یہ ایک ضروری عمل ہے۔ لیکن اس مجموعے میں شامل جمیل اختر شفیق کی 35 کہانیوں میں سے کسی ایک کہانی کو پڑھ کر ایسا نہیں لگتا کہ توجہ کہانی سے ذرا دیر کے لیے بھی ہٹی ہو۔ حالانکہ ان کہانیوں میں نہ اساطیر ہے اور نہ ہی کوئی غیر منطقی واقعہ۔ بچوں کے اندر دنیا کی آگہی اور دنیا سے جڑے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے جمیل اختر شفیق کی کہانی کے اسلوب کی پیروی ضروری بھی ہے اور تخریبی اخلاق کے اس دور میں مستحسن بھی۔ جمیل اختر شفیق کی کہانیوں کے موضوعات کو ایک نظر دیکھ کر ہی اس دعوے کی دلیل قاری کو مل جاتی ہے۔

گھر واپسی، ندامت کے آنسو، حماقت، اپنی فطری خوبیوں کو پہچانو، مجبوروں کی مدد سے مصیبتیں ٹل جاتی ہیں، علامہ ابنِ باز کا دانشمندانہ فیصلہ، تمھارے لیے بھی اس میں سبق ہے، احساس، حیرت انگیز تبدیلی، حیرانی، کسان کا شاعر بیٹا، آج اللہ نے میری مراد پوری کر دی، یقین، عبرت آموز خواب، عہد، عمل کی تاثیر، ایک ایسی موت جس نے...، احتساب، والدین کی صحبت کو غنیمت جانو، غیر متوقع کامیابی، بدگمانی، اولاد کو اولاد ہی رہنے دیجیے، مثالی طالب علم، ماں کی عظمت کا احساس، بیٹا غلطی میری بھی تھی، جیسی کہانیوں کے عنوانات بچوں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں، کہانی کے اختتام تک باندھے رکھتے ہیں اور قاری کے اندر علم وحکمت کے بیج بونے میں بھی کامیاب رہتے ہیں۔

جمیل اختر شفیق نے اپنی کہانیوں کے لیے جس زبان کا استعمال کیا ہے وہ عام فہم ہیں اور بچوں کے ذخیرۂ الفاظ کو بڑھانے میں کامیاب بھی نظر آ رہے ہیں اور باتیں اتنی دلچسپ ہیں کہ پڑھتے جایئے اور آنکھوں پہ پڑے پردے کو ہٹاتے جایئے۔ کہیں پر بھی اُکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ کہانیوں کی اسی خوبی کے پیش نظر پروفیسر شکیل احمد قاسمی نے کتاب میں شامل اپنے تاثرات میں لکھا ہے کہ ''جمیل اختر شفیق کی تحریریں پڑھتے ہوئے کئی بار میرے آنسوؤں نے ان کی کوشش و کاوش کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔'' کتاب میں شامل تعمیر سیرت اور کردار سازی کے پہلوؤں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے وہ آگے لکھتے ہیں کہ ''میرا مشورہ ہے کہ تعلیمی اداروں کے ذمہ داران اسے مناسب مقامات پر داخل نصاب یا خارجی مطالعے کا لازمی حصہ بنائیں۔'' جمیل اختر شفیق نے کتاب میں شامل اپنے مقدمے میں کہانیوں سے اپنی طبعی دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے امی سے کہانی سننے کی ضد اور اس کی پوری روداد کو دلنشین انداز میں بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ ''وقت کے ساتھ ساتھ جب شعور کی سطح تھوڑی بلند ہوئی، زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا شروع کیا تو قدم قدم پر رونما ہونے والے واقعات و حادثات، عبرت و موعظت کا ایک نیا تحفہ لیے کھڑے تھے۔ میں نے بس اتنا کیا کہ انھیں نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانے کے بجائے دل کے نہاں خانوں میں ان تحفوں کو بہت سلیقے سے سنبھال کر رکھا تاکہ آنے والی نسلیں مستفید ہو سکیں۔'' جمیل اختر شفیق کے اس تحفے کو پروفیسر شکیل احمد قاسمی کے علاوہ ڈاکٹر ارشد فہیم مدنی، ڈاکٹر عطا عابدی، ڈاکٹر کامران غنی صبا اور انظار احمد صادق نے بھی قیمتی گردانا ہے اور ادبِ اطفال سے متعلق لٹریچر میں اس اضافے کو وقعت کی نظر سے دیکھا ہے۔

امید ہے جمیل اختر شفیق کی تازہ کاوش کو ادب اطفال

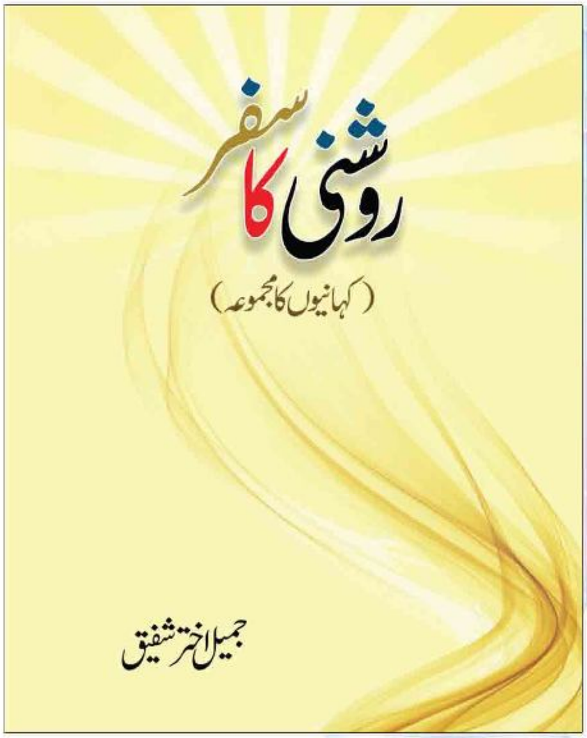

روشنی کا سفر مصنف: جمیل اختر شفیق، صفحات: 200
قیمت: 170 روپے، سنہ اشاعت: 2021، رابطہ: 7004771081

میں ایک قیمتی اضافہ سمجھا جائے گا اور بچوں کو زبان و ادب کی طرف متوجہ کرنے والے ادارے اس کتاب کی اہمیت کو سمجھ کر اسے بڑے پیمانے پر تقسیم و تشہیر کی طرف متوجہ بھی ہوں گے۔ حکومت اتر پردیش کا ادارہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی مبارک باد کی مستحق ہے کہ انھوں نے ادب اطفال کی طرف بھی توجہ کی اور اس کتاب کی نشر و اشاعت میں مدد فراہم کی۔ مصنف، ناشر اور ادب اطفال سے متعلق سبھی ہنرمندوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک۔

■

Shahid Habib
Maulana Azad National Urdu University
Lucknow Campus
504/122, Tagore Marg
Near Nadwa College, Daly Ganj
Lucknow- 226020 (UP)
Mob.:8539054888

عبدالمجید مکرو

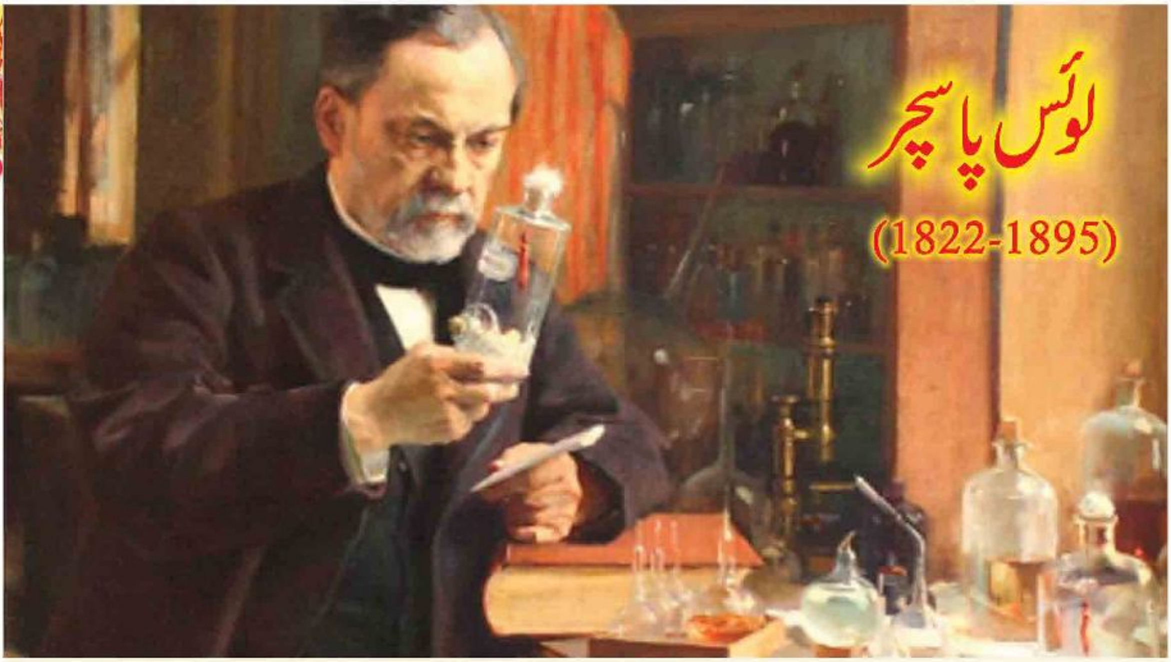

لوئس پاسچر
(1822-1895)

لوئس پاسچر (Louis Pasteur) فرانس کے ایک شہر ڈولے میں 1822 کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جین جوسیف فرنچ آرمی میں ملازم تھے۔ نپولین کی حکومت کے خاتمے پر جوسیف نے ٹیزی (Tazy) کا کاروبار شروع کیا۔ جوسیف اپنے بیٹے کے سلسلے میں فکرمند رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لوئس پرونس کے سیکنڈری اسکول میں تدریس کا کام کریں، لیکن لوئس پاسچر کی خواہشات اور دلچسپیاں کچھ اور ہی تھیں۔

پاسچر نے 15 سال کی عمر میں پورٹریٹ پینٹنگ (Portrait Painting) کا کام شروع کیا اور انھیں اس سلسلے میں کافی شہرت بھی ملی۔ کہا جاتا ہے کہ لوئس پاسچر کی پینٹنگ پاسچر انسٹی ٹیوٹ (Institute) میں آج بھی موجود ہے۔ لوئس کی خوبیوں کو دیکھ کر ان کے ایک استاد نے پیرس کے ٹیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ دلایا۔ پاسچر کی دلچسپی اب بھی سائنس اور ریاضی میں تبدیل ہونے لگی۔ پہلی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پاسچر نے ٹیچر نہ بن کر تحقیق کرنے کا ارادہ کیا، اور انھیں اس میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

جیروم بالاڈے سے لوئس پاسچر کی ملاقات ہوئی۔ انھوں نے لوئس میں تجرباتی صلاحیتوں کو محسوس کیا اور انھیں اپنی تجربہ گاہ میں لیبوریٹری اسسٹنٹ رکھ لیا۔ شاید لوئس اس موقعے کی تلاش میں تھے۔ لوئس پاسچر نے ٹارٹیرک ایسڈ کرسٹل (Tartaric Acid Crystals) پر آپٹیکل اسٹڈیز (Optical Studies) کیں۔ جین بیپ ٹسٹ بیوٹ (Jean Baptist Biot) نے منسٹری آف ایجوکیشن کی طرف سے ڈائجون سیکنڈری اسکول میں لوئس پاسچر کا بنیادی طبیعیات کی تدریس کے لیے تقرر کیا گیا۔ کچھ وقفے کے بعد منسٹری نے اسٹریس برگ یونیورسٹی میں علم کیمیا میں ایکٹنگ پروفیسر کے عہدے پر انھیں فائز کیا۔

29 مئی 1849 کو لوئس نے یونیورسٹی ریکٹر کی بیٹی میری لارنٹ سے شادی کی۔ زندگی ہنسی خوشی کے ساتھ گزر رہی تھی۔ بچے بھی ہوئے لیکن بیماری کی وجہ سے سب ہی بچوں کی موت واقع ہوجاتی تھی جس کی وجہ سے لوئس پاسچر کی زندگی دکھ سے

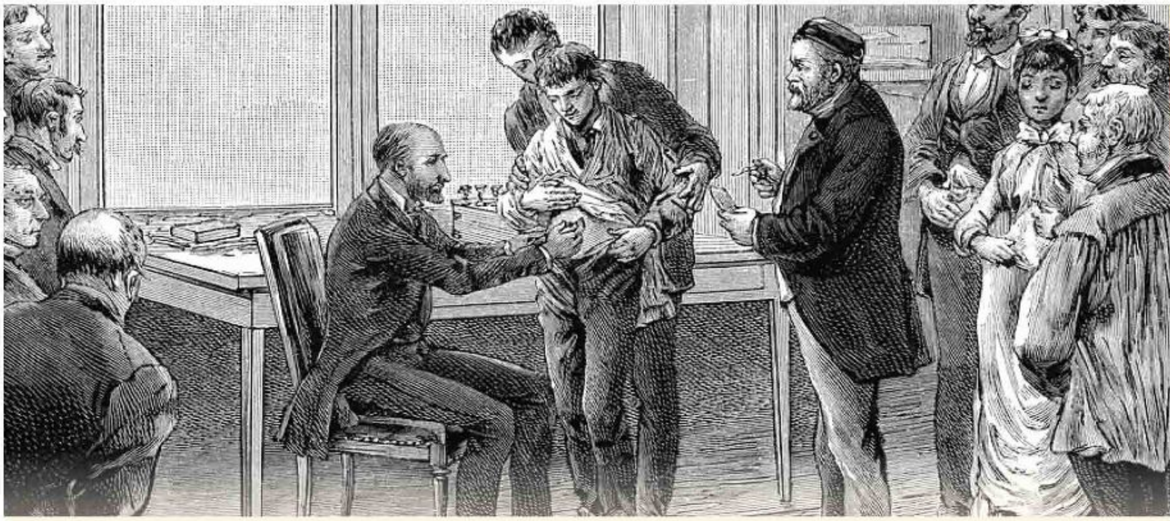

بھرگئی۔ لوئس پاسچر کی زندگی اور دل میں بچپن کی کچھ تلخ یادگاریں پوشیدہ تھیں۔ ان دنوں کتے کے کاٹے Bosbite مریضوں یا بڑے بڑے زخموں کے علاج وہاں کے مقامی لوہار کیا کرتے تھے، گرم لوہے سے زخم کو جلانے کا کاروبار بہت دردناک ہوتا تھا۔ پاسچر کا ذہن اس کے علاج کے لیے دوائیں تیار کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ اسی زمانے میں فرانس میں انگور کی شراب کا بازار گرم تھا، لیکن کسی وجہ سے یہ شراب خراب ہوجاتی تھی جس کی وجہ سے انڈسٹری کو کافی نقصان اٹھانا پڑرہا تھا۔ اس مسئلے کے لیے لوئس پاسچر کی خدمات لی گئیں۔ آپ نے جرم تھیوری آف فرمین ٹیشن (Germ Theory of Fermantation) پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ مائکرو اورگینزم (Microorganism)، ہر چیز کو خراب کرتے ہیں اور ان کی موجودگی کی تصدیق صرف مائیکرو اورگینزم موجود ہیں تو اسے خاص درجہ حرارت پر گرم کرنے پر محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ یہ تکنیک پاشچورائی زیشن(Posteurization) نام سے مشہور ہوئی، اسی دوران فرانس کی Silky Industry میں سلک ڈریز نے کہرام مچا رکھا تھا اور یہ سخت تباہی کی کگار تک پہنچ چکی تھی۔ لوئس پاسچر نے صحت مند سلک وارم کو الگ کرکے ان کے انڈوں سے صحت مند بچے پیدا کیے اور ان سلک وارم Silk Worm سے سلک صنعت کو تباہی سے بچایا۔

بچپن کے لوہار والے واقعہ نے لوئس پاسچر کو ایک بار پھر ریبیز (Rabbies) کے علاج کی تدابیر سوچنے کے لیے مجبور کیا۔ انھوں نے اپنی ساری صلاحیت اور وقت اینٹی ریبیز ٹریٹمنٹ(Anti Rabbies Treatment) کی تحقیق پر صرف کیا اور انھیں اس میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ یہ تحقیق لوئس کی سب سے اہم تحقیق مانی جاتی ہے۔

لوئس پاسچر کی اس تحقیق کو ساری دنیا نے سراہا۔ لوئس پاسچر نے دنیا والوں کو اینٹی ریبیز دوا سے جسمانی تکالیف کو دور کرنے کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ دیا۔ 28 ستمبر 1895 کو یہ عظیم سائنسداں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ لیکن اس نے اپنا آج ہمارے کل کے لیے محفوظ کرلیا۔ سائنس برادری اس عظیم سائنداں کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔

■

Abdul Majeed Makroo
S/o Ab Gani Makroo
Arwani, Bijbehara
R/o Arwani, Kulgam
Anant Nag Bijbehra- 192124 (J&K)
Mob.: 08899964508

یادداشت بڑھانے کے 9 آسان طریقے

صحت ہی زندگی ہے، یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات اردو کے ایک شاعر نے بھی کہی ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک تندرستی ہزار نعمت ہے

صحت اور تندرستی زندگی کے لیے بہت لازمی ہیں۔ ذہنی صحت کے لیے جسمانی صحت کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اگر شروع سے ہی صحت اور تندرستی کے تعلق سے لاپرواہی کے بجائے بیداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو انسان بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بچوں کی صحت ایک بڑا مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی صحت کے تعلق سے 'بچوں کی دنیا' میں یہ کالم اس لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ والدین کے ساتھ ساتھ بچے خود بھی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھ سکیں۔

انسان کی عمر جیسے جیسے بڑھتی ہے، اس کی یادداشت کمزور ہوتی جاتی ہے، لیکن ہر شخص احتیاطی تدابیر اپنا کر اپنی یادداشت کو طویل عرصے تک برقرار رکھ سکتا ہے۔ ان تدابیر کو اختیار کرنا چنداں مشکل نہیں جو درج ذیل ہیں:

(1) دماغ مضبوط کرنے والی غذائیں:

ان میں وہ غذائیں سرفہرست ہیں جن میں اومیگا 3 فیٹس، گلوکوز (ثابت اناج) اور ضد تکسیدی مادے (Antioxidants) ملتے ہیں۔ مزید برآں دن میں پانچ چھ بار کھانا کھایئے وجہ یہ ہے کہ وقفے وقفے سے تھوڑا کھانا کھانے سے خون میں گلوکوز کی سطح برقرار رہتی ہے اور دماغ بنیادی طور پر گلوکوز ہی سے توانائی حاصل کرتا ہے۔

(2) دماغ کو مصروف رکھیے:

ایسی سرگرمیاں اپنایئے جن سے دماغ کی ورزش ہو۔ مثلاً معمے حل کیجیے اور کراس ورڈ پزل کھیلیں۔ ان

سرگرمیوں سے دماغ کی ورزش ہوتی ہے اور وہ چاق و چوبند رہتا ہے۔

(3) جسم کو فٹ رکھیے:

روزانہ صبح سویرے یا شام کو تیز چہل قدمی کیجیے اور بدن پھیلانے والی ورزش کیجیے۔ ان ورزشوں کے ذریعے نہ صرف دماغ کا سفید مادہ بڑھتا ہے بلکہ مزید نیورون (خلویاتی) کنکشن بھی جنم لیتے ہیں۔

(4) دباؤ نہ بڑھنے دیں:

ورزش سے ذہنی و جسمانی دباؤ کم کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ دراصل اس دباؤ کے باعث جسم میں Cortisone کیمیائی مادہ پیدا ہوتا ہے جو دماغ کے مراکزِ یادداشت کو سکیڑ دیتا ہے۔ مزید برآں عبادت اور مراقبہ بھی یادداشت بڑھانے میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔

(5) فولاد کی سطح چیک کریں:

ہمارے دماغ کے خصوصی خلیے نیوروٹرانسمیٹر ہماری یادداشت عمدہ حالت میں رکھتے ہیں اور یہ خود فولاد کے ذریعے توانا رہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے بدن میں اس اہم معدن کی کمی نہ ہونے دیجیے۔ جن مرد وزن میں فولاد کی کمی ہو، وہ عموماً بھلکڑ بن جاتے ہیں۔

(6) ایک وقت میں ایک کام:

کئی مرد وزن ٹی وی پر خبریں سنتے ہوئے کھانا کھاتے اور کبھی کبھی تو اخبار بھی پڑھنے لگتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یوں انھیں نہ سنی گئی خبریں یاد رہتی ہیں اور نہ ہی پڑھا گیا مواد۔ یہ کھانے کا صحت بخش طریقہ بھی نہیں۔

دراصل جب ہم ایک وقت میں دو یا زائد کام کریں، تو دماغ پروسیسنگ کا عمل ایسے علاقوں میں منتقل کر دیتا ہے جو تفصیل سے یادیں محفوظ نہیں کرتے، لیکن ایک وقت میں ایک کام کیا جائے تو دماغ اس کی جزئیات تک محفوظ رکھتا ہے۔

(7) کولیسٹرول پر قابو پائیے:

انسانی جسم میں کولیسٹرول کی زیادتی بڑا خطرناک عمل ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف دل کی شریانوں میں چربی جمتی ہے بلکہ دماغ میں بھی خون کی نسوں میں لوتھڑے جنم لیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے دماغ کو قیمتی غذائیت نہیں ملتی اور بتدریج یادداشت جاتی رہتی ہے۔ واضح رہے کہ دماغ میں تھوڑی سی چربی بھی نسیں بند کر ڈالتی ہے۔ لہٰذا اپنا کولیسٹرول اعتدال پر رکھیے۔

(8) ادویہ پر نظر رکھیں:

کئی ادویہ انسانی یادداشت پر منفی اثرات ڈالتی ہیں اور ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ انسان جتنا بوڑھا ہو، وہ اتنی ہی دیر تک اس کے بدن میں رہتی ہے۔ نظام یادداشت پر اثر انداز ہونے والی ادویہ میں اینٹی ڈیپریسنٹ، بیٹا بلاکرز، کیموتھراپی، پارکنسن مرض کی دوائیں، نیند آور، درد کش، اینٹی ہسٹا مائنز اور اسٹاٹینس شامل ہیں۔

(9) ایک سیب روزانہ کھائیے:

سیب میں شامل ضد تکسیدی مادوں کی بلند مقدار زیادہ ایسیٹلکولین (Acetylcholine) کیمیائی مادہ پیدا کرتی ہے۔ دماغ میں ملنے والا یہ نیوروٹرانسمیٹر عمدہ یادداشت کے لیے لازمی ہے۔ مزید برآں درج بالا ضد تکسیدی مادے دماغ کو مضر صحت آزاد خلیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

■

ماخذ: علاج ومعالجہ، مصنف: سالک دھامپوری
سنہ اشاعت: 2017، ناشر: جے پی ایس پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
موبائل: 8368527254

لفظوں کا صحیح استعمال

اچھی اردو لکھنے کے لیے بہت سی باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔ لفظ کا صحیح املا، معانی، موزوں استعمال اس کے علاوہ روزمرہ محاورہ سے واقفیت لازمی ہے۔ عام طور پر اردو میں زبان و بیان کی بہت سی غلطیاں اس لیے سرزد ہو جاتی ہیں کہ لکھنے والے اردو قواعد سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔ اردو قواعد، انشا اور تلفظ کے حوالے سے بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں قواعد اردو (مولوی عبدالحق)، اردو قواعد (ڈاکٹر شوکت سبزواری)، اردو انشا پردازی (امیر حسن نورانی)، اردو قواعد و انشا پردازی (ماہ لقا رفیق) قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی اردو کتابیں ہیں جن میں اردو انشا اور تلفظ کے تعلق سے تفصیلات موجود ہیں۔ طلبا کو چاہیے کہ عبارت کو بامعنی اور خوبصورت بنانے کے لیے ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں۔ ممتاز محقق رشید حسن خان کی کتاب 'انشا اور تلفظ' اس ذیل میں بڑی اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔

'نہیں' کے ساتھ 'ہے' یا 'ہیں' لانا بہت سے مقامات پر اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ صاف صاف دکھائی دیتا ہے کہ 'ہے' یا 'ہیں' زائد لفظوں کی طرح آئے ہیں۔ مثلاً اِس جملے کو دیکھیے ''وہ شخص اپنی دکان پر موجود نہیں ہے'' یہاں 'ہے' بے کار نظر آتا ہے۔ اس جملے کو اگر اس طرح لکھا جاتا ''وہ شخص اپنی دکان پر موجود نہیں'' تو بات بھی مکمل ہو جاتی اور بیان کے لحاظ سے جملہ بہتر ہو جاتا۔ یا محض بہ طورِ مثال اِس عبارت کو دیکھیے ''وہ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں، دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں'' اِسے اگر یوں لکھا جائے ''وہ کہیں آتے جاتے نہیں، دن بھر گھر میں بیٹھے رہتے ہیں'' تو واضح طور پر معلوم ہوگا کہ یہ بہتر صورت ہے۔ پہلے جملے میں 'نہیں ہیں' میں 'ہیں' صاف طور پر زائد معلوم ہوتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ 'نہیں ہے' یا 'نہیں ہیں' یہ دونوں ٹکڑے بہت سے مقامات پر حسنِ بیان کے لحاظ سے غیر مناسب نظر آتے ہیں۔ جب بھی فعل کی اس صورت کو استعمال کیا جائے تو یہ ضرور دیکھ لیا جائے کہ ادائے مطلب اور حسنِ عبارت کے اعتبار سے صورتِ حال کیا ہے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ اکثر مقامات پر 'نہیں' اور 'ہے' کا ساتھ ساتھ آنا اچھا نہیں معلوم ہوگا۔ مثلاً ''کوئی شخص جان بوجھ کر نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا ہے'' یہاں بھی 'ہے' زائد معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بہتر صورت یہ ہوسکتی ہے ''کوئی شخص جان بوجھ کر نقصان اٹھانا گوارا نہیں کرتا۔'' زائد لفظ عام طور پر عبارت کو بگاڑ دیا کرتے ہیں، ایسے مقامات پر 'ہے' بھی یہی کیا کرتا ہے۔ 'نہیں ہیں' میں بھی بہت سے مقامات پر یہی خرابی چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات ضرور نظر میں رہنا چاہیے کہ ایسے مقامات بھی سامنے آتے ہیں جہاں 'نہیں ہے' یا 'نہیں ہیں' غیر مناسب نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اس جملے کو دیکھیے ''یہ لفظ ابھی تک زبان میں گھل مل نہیں سکا ہے۔'' اس جملے میں وہ بات نہیں جو مثلاً اس جملے میں ہے: ''وہ گھر میں جاتے نہیں ہیں'' یوں کہ اس آخری جملے میں 'ہیں' غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

لکھنے والے کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ دیکھ لے کہ 'نہیں' کے ساتھ 'ہے' یا 'ہیں' لانا کس مقام پر مناسب ہے اور کہاں غیر مناسب۔ مثلاً یہ پوچھا جائے: وہ گھر میں ہیں؟ اس کا جواب صرف 'نہیں' بھی ہوسکتا ہے اور 'نہیں ہیں' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب یہ کہنے والے پر ہے کہ وہ سمجھ لے کہ یہاں 'ہیں' ضروری ہے یا غیر ضروری۔ ذرا اس عبارت کو دیکھیے:

''آپ نے 'نکہت' لکھا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصل لفظ 'نکہت' ہے۔ نون کے اوپر زبر ہے اور نون کے بعد کاف ہے، گاف نہیں ہے۔''

اس عبارت کے آخر میں 'نہیں ہے' آیا ہے۔ 'نہیں' کے بعد 'ہے' لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح 'نون کے اوپر' کے بجائے 'نون پر' لکھنا بہتر تھا۔ ''نون کے اوپر زبر ہے اور نون کے بعد کاف ہے۔'' اس ٹکڑے میں لفظ 'نون' کی تکرار کھٹکتی ہے، خاص کر یوں کہ دونوں لفظوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ اس عبارت کو اس طرح لکھا جاسکتا تھا:

''آپ نے 'نکہت' لکھا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اصل لفظ 'نکہت' ہے۔ نون پر زبر ہے اور اس کے بعد گاف نہیں، کاف ہے۔''

اصل بات تو مکمل ہوگئی۔ اب ضمنی طور پر یہ کہنا ہے کہ واقعی اصل لفظ 'نکہت' ہے۔ نون پر زبر ہے اور اس کے بعد کاف ہے (نَ۔کْ۔ہَ۔ت)۔ اس کے معنی ہیں: خوش بو۔ اِسے 'نگہت' نہیں لکھنا چاہیے اور بولنا چاہیے نون کے زبر کے ساتھ۔

ہاں شاعری میں 'نہیں ہے' کچھ زیادہ ملتا ہے۔ شاعری کی بات الگ رہی۔ یہاں نثر کی بات ہو رہی ہے۔ نثر میں اِس طرف خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

○

یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ جملے میں جس قدر مفرد لفظ لکھے جائیں، ان کے معنی معلوم ہونا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان کو جملے میں کس جگہ اور کس طرح لایا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ عبارت میں اگر مرکب لفظ آئے ہوں تو ان کے متعلق بھی اطمینان کرلیا جائے۔

ایک مضمون میں یہ جملہ لکھا ہوا تھا ''اہلِ ہنود کی کتابوں میں یہ سب باتیں لکھی ہوئی ہیں''— 'اہلِ ہنود' صحیح ترکیب نہیں— 'اہلِ ہند' ضرور صحیح مرکب ہے، اس کے معنی ہیں: ہندستان والے۔ اِس میں ہندو مسلمان، سکھ عیسائی (وغیرہ) سبھی شامل ہیں۔ اس جملے میں 'اہلِ ہند' کا محل نہیں، یوں لکھنا چاہیے تھا: ہندوؤں کی کتابوں میں... 'اہلِ ہنود' کے تو کچھ معنی ہی نہیں۔

○— کسی مضمون یا کتاب وغیرہ کی تعریف میں یہ لکھنا کہ یہ معرکۃ الآرا مضمون یا کتاب ہے، یا مثلاً کسی غزل کی تعریف میں یہ کہنا کہ یہ بڑی معرکۃ الآرا غزل کہی ہے، درست نہیں۔ تعریف کے بجائے اس سے تو برائی ظاہر ہوگی، یعنی بات ہی بدل جائے گی، بلکہ یوں کہیے کہ بگڑ جائے گی۔

'معرکۃ الآرا' کے معنی ہیں: جس میں اختلاف رائے بہت ہو۔ اصل میں 'معرکۃ الآراء' تھا، یعنی آخر میں ہمزہ بھی تھا، اردو میں آکر ہمزہ تو نکل گیا (اِس لیے کہ وہ تلفظ میں نہیں آتا تھا) 'معرکۃ الآرا' رہ گیا۔ 'آراء' جمع ہے 'رائے' کی۔ یہ عربی کا لفظ ہے۔

ایک اور مرکب ہے: معرکہ آرا۔ اِس میں 'آرا' فارسی کا لفظ ہے۔ 'آراستن' مصدر سے بنا ہے۔ 'معرکہ آرا' کے معنی زبردست، پرزور' بھی ہیں۔ اسی نسبت سے عمدہ غزل کو 'معرکہ آرا' کہہ دیتے ہیں۔ معرکے کی غزل کہی ہے، معرکہ آرا غزل کہی ہے؛ یہ صحیح اندازِ بیان ہوگا۔ اگر اِس جگہ 'معرکۃ الآرا' کہا جائے گا تو اس کا مطلب اس سے مختلف ہوگا۔

○— ایک مرکب 'جیب وگریباں' کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کی ترکیب کو سمجھ لینا چاہیے، تاکہ غلطی نہ ہو۔

'جیب' اور 'جَیب' دو مختلف لفظ ہیں۔ 'جیب' مونث ہے، جو مثلاً اس شعر میں آیا ہے:

ہم کہیں آتے اِس فریب میں ہیں　　تم سے سوا پیسے میری جیب میں ہیں

یہی 'جیب' کبھی کبھی کٹ بھی جایا کرتی ہے۔ اسی سے 'جیب کترا' بنا ہے— 'جَیب' دوسرا لفظ ہے۔ اِس میں جیم پر زبر ہے اور یہ مذکر ہے، جو مثلاً مرزا دبیر کے اس شعر میں آیا ہے:

تھی صبح یا وہ چرخ کا جَیب دریدہ تھا　　یا چہرۂ مسیح کا رنگِ پریدہ تھا

یا مثلاً مرزا غالب کا یہ شعر:

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہمارے جَیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

یا جیسے غالب ہی کا یہ شعر:

دیوانگی سے دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہمارے جَیب میں اک تار بھی نہیں

'جَیب' کے معنی ہیں: گریبان۔ اِس لحاظ سے 'جَیب و دامن' صحیح مرکب ہے۔ اِس کے معنی ہوئے: دامن اور گریبان۔ اس کے برخلاف 'جَیب و گریباں' صحیح مرکب نہیں، کیونکہ دونوں لفظوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ 'جَیب و گریباں' کے معنی ہوئے: گریبان گریبان۔ ان دونوں لفظوں 'جیب' اور 'جَیب' میں امتیاز کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ بات ذہن میں نہیں ہوگی تو عین ممکن ہے کہ غالب کے شعروں میں 'جَیب' کو 'جیب' پڑھا جائے (ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے) اور مصرعے کو بے معنی بنادیا جائے۔

○— ایک مرکب ہے 'خط و خال'۔ اِسے 'خدّ و خال' بھی لکھا گیا ہے۔ یہاں بھی وہی بات ہے۔ 'خد' اور 'خال' دونوں کے ایک ہی معنی ہیں: تل— 'خطّ و خال' لکھنا چاہیے۔

■

ماخذ: انشا اور تلفظ، **مصنف:** رشید حسن خاں، **ناشر:** مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، **اشتراک:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر وتقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔
'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر وتقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں
اکبرالہ آبادی

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
علامہ اقبال

جو طوفانوں میں پلتے جا رہے ہیں
وہی دنیا بدلتے جا رہے ہیں
جگرمرادآبادی

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
جمیل مظہری

یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں
ماہرالقادری

ساحل کے سکوں سے کسے انکار ہے لیکن
طوفان سے لڑنے میں مزہ اور ہی کچھ ہے
آل احمد سرور

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
مجروح سلطانپوری

ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں
ساحرلدھیانوی

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا
محشر بدایونی

یقین ہو تو کوئی راستہ نکلتا ہے
ہوا کی اوٹ بھی لے کر چراغ جلتا ہے
منظور ہاشمی

جہاں پہنچ کے قدم ڈگمگائے ہیں سب کے
اسی مقام سے اب اپنا راستا ہوگا
عابدادیب

لوگ جس حال میں مرنے کی دعا کرتے ہیں
میں نے اس حال میں جینے کی قسم کھائی ہے
امیر قزلباش

تدبیر سے تقدیر بدلی

کسی گاؤں میں ایک کسان اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ کسان بہت غریب تھا اور گاؤں کے زمیندار سے بہت سا قرض لے چکا تھا۔ اس قرض کو چکانے کے لیے اس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے۔ زمیندار جو کہ ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ کسان کی اکلوتی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو بہت خوبصورت اور ذہین تھی۔ ایک دن زمیندار نے کسان کو بلا کر کہا ”میں تمھارے سامنے دو تجاویز رکھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ تم مجھ سے اپنی بیٹی کی شادی کرادو، میں تمھارا سارا قرض معاف کردوں گا۔ نہیں تو پنچایت چلو وہاں جو فیصلہ لیا جائے گا وہ تمھیں اور مجھے ماننا ہوگا۔ کسان نے دوسری تجویز منظور کرلی اور دونوں پنچایت چلے گئے۔ پنچایت نے جب پورا معاملہ سنا تو کہا ”معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ چلو اس معاملے کو قسمت پر چھوڑتے ہیں۔ زمیندار ایک تھیلی میں دو پتھر ڈالے گا۔ ایک سفید دوسرا کالا۔

کسان کی بیٹی کو ایک پتھر تھیلی میں سے نکالنا ہوگا۔ اگر کسان کی بیٹی کالا پتھر نکالتی ہے تو اس کی شادی زمیندار سے کردی جائے گی اور کسان کا سارا قرض معاف ہوجائے گا اور اگر وہ سفید پتھر نکالتی ہے تو کسان کا سارا قرض معاف ہوجائے گا اور ساتھ ہی ساتھ کسان کی بیٹی کو زمیندار سے شادی بھی نہیں کرنی پڑے گی لیکن اگر کسان کی بیٹی پتھر نکالنے سے بھی منع کردیتی ہے تو کسان کو جیل بھیج دیا جائے گا۔ کسان کی بیٹی اس پورے معاملے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ تب ہی اس نے دیکھا کہ زمیندار نے تھیلی میں دونوں کالے پتھر ڈالے ہیں۔ اب تو کسان کی بیٹی بہت گھبرائی اور سوچ میں پڑگئی کہ کیا کیا جائے۔ یکا یک اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے تھیلی میں سے ایک پتھر نکالا اور خود دیکھے بغیر اور دوسروں کو دکھائے بغیر پتھر کو زمین پر گرادیا اور کہا اُف جو پتھر میں نے تھیلی میں سے نکالا وہ تو غلطی سے زمین پر گرگیا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ دیکھتے ہیں کہ تھیلی کے اندر کون سا پتھر بچ گیا ہے۔ اس طرح پتا چل جائے گا کہ میں نے کون سا پتھر نکالا تھا۔ جب تھیلی میں سے پتھر نکالا گیا تو وہ کالا تھا۔ سب نے مان لیا کہ کسان کی بیٹی نے سفید پتھر نکالا تھا۔ اس طرح کسان کی بیٹی کو زمیندار سے شادی بھی نہیں کرنی پڑی اور کسان کا سارا قرض بھی معاف ہوگیا۔ ■

مرسلہ: ہاجرہ، درجہ ششم
محمد شریف سوداگر ہائی اسکول ورسا، ضلع گڑھ جرولی، مہاراشٹر

ارتضٰی ندیم بنت محمد ندیم، درجہ ششم سی، الفلاح پبلک اسکول، مالیرکوٹلہ، پنجاب

محمد مصعب بن مولانا محمد عادل ندوی، درجہ ہشتم
المنار پرائمری اینڈ ہائی اسکول، چکھلی، پونہ، مہاراشٹر

محمد واعظ، درجہ پنجم، ویلی انٹرنیشنل اسکول، نوئیڈا، یوپی

محمد اسد، درجہ اوّل، کیندریہ ودیالیہ، بارک پور (آرمی)، کمرہاٹی، کولکاتا، مغربی بنگال

محمد حمزہ صدیقی، درجہ دوم، شاہین پبلک اسکول، جامعہ نگر، نئی دہلی

محمد عبدالرافع، درجہ ششم، سینٹ اینڈریوز اسکول، بوین پلی، حیدرآباد، تلنگانہ

محمد شبیر، درجہ چہارم، سوشل ویلفیئر
گورنمنٹ اسپانسرڈ فری پرائمری اسکول، کمرہاٹی، کولکاتا، مغربی بنگال

شیزان دانش، درجہ اوّل بی، کے وی کمانڈ ہاسپٹل، کولکاتا، مغربی بنگال

نبیرا نعیم بنت محمد نعیم، درجہ چہارم بی، الفلاح پبلک اسکول، مالیرکوٹلہ، پنجاب

رائقہ رئیس، درجہ سوم، ہمالین بیلز انٹرنیشنل اسکول بدرا گنڈ قاضی گنڈ، کشمیر

محمد اریب محمد شارق، درجہ ششم، مالیگاؤں ہائی اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر

محمد معاویہ، درجہ دوم، ایم ایس کریٹیو اسکول، اولڈ دہلی 6

یوم جمہوریہ کے موقع پر بچوں کا جوش و خروش

تقریب پرچم کشائی میں ننھے منے بچے حصہ لیتے ہوئے

बच्चों की दुनिया मासिक, मार्च 2022, वर्ष 10, अंक 03
BACHON KI DUNIYA Monthly, March 2022 Vol. 10, Issue: 03
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/02/2022
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات:16، قیمت:20 روپے

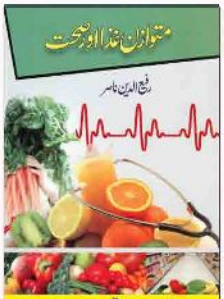

صفحات:194، قیمت:115 روپے

صفحات:15، قیمت:20 روپے

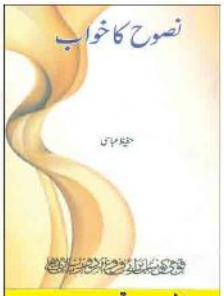

صفحات:424، قیمت:14 روپے

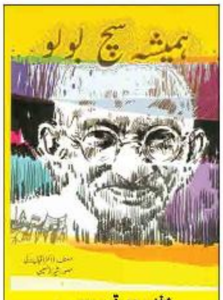

صفحات:16، قیمت:20 روپے

صفحات:51، قیمت:20 روپے

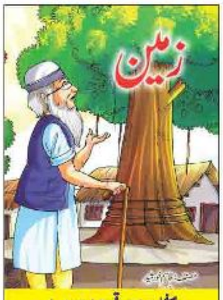

صفحات:16، قیمت:25 روپے

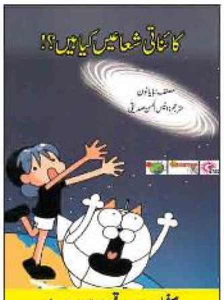

صفحات:15، قیمت:20 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6